BUDC-110
Tanqeed Aur Blaghat

تنقیداور بلاغت

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY
ڈسپلن آف اردو، اسکول آف ہیومنٹیز
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

بلاک

3

نمائندہ ناقدین

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 9
کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری 129

اکائی 10
آل احمد سرور کی تنقید نگاری 143

اکائی 11
سید احتشام حسین کی تنقید نگاری 155

اکائی 12
شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری 169

اکائی 13
گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری 179

بلاک 3 تعارف

تیسرے بلاک میں ''**نمائندہ ناقدین**'' کی پیشانی لگا کر کل پانچ (۵) اکائیوں (اکائی نمبر ۹ تا ۱۳) کو شامل کیا گیا ہے۔ نویں اکائی ''کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری''، دسویں اکائی ''آل احمد سرور کی تنقید نگاری''، گیارہویں اکائی ''سید احتشام حسین کی تنقید نگاری''، بارہویں اکائی ''شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری''، تیرہویں اکائی ''گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری'' شامل بلاک ہیں۔ ان پانچوں ناقدین کا بنیادی تعلق بیسویں صدی سے ہے۔ ان میں دو ناقدین شمس رحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کی تنقیدی کاوشیں اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائی کو بھی محیط ہے؛ لیکن اس کے باوجود یہ دونوں ناقدین بیسویں صدی کے ہی نمائندہ ہیں، کیوں کہ دونوں کے افکار و نظریات کی تشکیل بیسویں صدی میں ابھرنے والے تنقیدی تصورات سے ہی مستعار ہیں۔ یہ پانچوں ناقدین بیسویں صدی کے مختلف النوع اہم تنقیدی مکتب فکر کے نمائندہ ہیں۔ اس لیے ان ناقدین کا انتخاب خصوصی طور سے نصاب میں کیا گیا ہے تاکہ طلبا و طالبات بیسویں کے اہم تصورات، رجحانات اور تحریکات کے تنقیدی رویوں سے بہ خوبی واقف ہو سکیں۔

اکائی 9 کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری

ساخت:

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری

9.3.1 کلیم الدین احمد: حیات وخدمات

9.3.2 کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری

9.3.3 ماحصل

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالوں کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی میں آپ:

- کلیم الدین احمد کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- کلیم الدین احمد کی ادبی خدمات سے متعارف ہوں گے۔
- کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات سے روشناس ہوں گے۔
- کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے امتیازات سے واقف ہوں گے۔
- اردو تنقید میں کلیم الدین احمد کے مقام ومرتبے سے آگاہ ہوں گے۔

9.2 تمہید

عزیز طلبا/ طالبات! آپ نے پچھلی اکائی میں علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کے امتیازات اور ان کے تفہیمی طریق کار سے واقفیت حاصل کی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی جانا کہ علامہ شبلی کا نظام نقد خالص مشرقی ہے۔ انھوں نے مشرقی

تصورِ نقد کی روشنی میں شعر و ادب کا جائزہ لے کر اردو تنقید کو بالیدگی عطا کی۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں اردو کے ایک معتبر ناقد کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کو پڑھیں گے۔ کلیم الدین احمد ایک متنازعہ اور شدت پسند نقاد کی حیثیت سے اردو تنقید میں متعارف ہوئے۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ وہ مغربی تنقید بالخصوص انگریزی ادب کی روشنی میں اردو ادب کو پرکھنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کاوش بہت اچھی تھی، لیکن وہ اس میں اعتدال قائم نہ رکھ سکے۔ اس کے باوجود ان کی تنقیدی کاوشیں مغربی استفادہ کی وجہ سے اردو تنقید کو اس مقام تک پہنچایا جس مقام پر دیگر عالمی ادب کی تنقیدیں تھیں۔

9.3 کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری

9.3.1 کلیم الدین احمد: حیات و خدمات

کلیم الدین احمد کے بارے میں بہت سی سوانحی معلومات ہمیں ان کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' میں مل جاتی ہیں۔ وہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں: ''میری پیدائش کا دن منگل، ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء اور وقت ساڑھے چھ بجے شام ہے۔ البتہ میٹرکولیشن کی سند میں ۱۹۰۹ء ہے۔ پیدائشی نام 'رحیم الدین احمد' تھا، اسی نسبت سے گھر میں رحمو بلائے جاتے تھے۔ لیکن جب اسکول میں داخلہ کرانا تھا تو 'کلیم الدین احمد' نام سے داخلہ کرایا گیا۔ جنوری ۱۹۲۱ء سے میں کلیم الدین احمد ہو گیا۔'' (ص:۳۴) ان کے پیدائش کا مقام خواجہ کلان پٹنہ سٹی تھا اور ان کے خانوادے کا تعلق 'صادق پور' سے تھا۔ کلیم الدین احمد کے دادا سید شاہ واعظ الدین احمد اپنے علاقے کی اہم شخصیت تھی۔ والد عظیم الدین احمد بھی مشرقی و مغربی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ انھیں ۱۹۹۰ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے ریاستی وظیفہ مل گیا اور وہ لائپ زگ یونیورسٹی جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر وہ لاہور اورینٹل کالج میں پروفیسر، بعد ازاں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے پٹنہ کالج میں بھی عربی و فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ کلیم الدین احمد کی والدہ کا نام نفیسہ خاتون تھا۔ ان کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہی ہو گیا تھا۔ کلیم الدین کے بڑے بھائی کا نام نعیم الدین احمد (نمو بھائی) تھا اور بڑی بہن کا نام محمودہ (پھودی) تھا جو چار سال کی عمر میں ہی چل بسی۔ ۱۹۲۸ء میں کلیم الدین احمد کی شادی عبدالحفیظ کی بیٹی حنیفہ بیگم (حنی) سے ہوئی۔ ان کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہی ہو گیا تو کلیم الدین احمد نے ۱۹۴۰ء میں نسبتی بہن (سالی) زہرہ بیگم سے دوسری شادی کی۔

کلیم الدین احمد کی تعلیم کا آغاز محلے کی محمدی جان مسجد کے ایک مدرسے سے ہوا۔ ان کے استاد حافظ عبدالکریم تھے۔ گھر میں بھی انھوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ اپنے والد سے جاری رکھا۔ یہاں پر انھیں قاعدۂ بغدادی، قرآن شریف، اردو میں پہلی دوسری اور تیسری کتاب، فارسی میں آمد نامہ کریمہ، گلستان، میزان منشعب، صرف میر، نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایت النحو، کافیہ، انگریزی میں King's Reader وغیرہ پڑھائی گئیں۔ ۱۹۲۱ء میں وہ محمڈن اینگلو

عربک اسکول میں داخل کیے گئے۔۱۹۲۴ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔۱۹۲۸ء میں انگریزی میں آنرز کیا۔۱۹۳۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ہی ایم۔اے انگریزی فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا۔مزید تعلیم کے لیے جب انھیں ریاستی وظیفہ مل گیا تو وہ اسی سال ۱۷ستمبر کو کیمبرج انگلینڈ روانہ ہوگئے۔وہاں سے ڈگری کی حصول یابی کے بعد وہ فرانس، ہالینڈ، بلجیم، جرمنی، سوئٹزرلینڈ کی سیر وسیاحت کر کے ۱۹۳۳ء میں وطن لوٹے۔اور پٹنہ کالج میں خدمت انجام دینے لگے۔۱۹۳۷ء میں بہار ایجوکیشن سروس میں کلاس۔Ist ملا۔۱۹۴۷ء میں ڈی۔ڈی۔پی۔آئی (DDPI) کا عہدہ ملا۔۱۹۵۰ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔۱۹۵۲ء میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوگئے اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے۔۱۹۵۸ء میں ڈی۔پی۔آئی (DPI) ہوگئے۔۱۹۶۴ء میں بہار سکنڈری اسکول اگزامنیشن بورڈ کے اعزازی چیرمین اور بھاگل پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ستمبر ۱۹۶۷ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔اس کے بعد ۱۹۷۰ء تک بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ میں چیئرمین کے عہدے پر فائز رہے۔انھوں نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی۔۱۹۷۳ء میں انھیں غالب ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں بہار سرکار میں ڈی۔پی۔آئی (DPI) مقرر کیے گئے۔۱۹۸۰ء میں ''اعزازِ میر'' کی سند سے نوازے گئے اور بہار اردو اکادمی کے نائب صدر بھی بنائے گئے۔۱۹۸۱ء میں انھیں ادبی خدمات کے عوض حکومت ہند نے ''پدم شری'' کا خطاب عطا کیا۔۱۹۸۳ء میں کرشنا پوری، پٹنہ میں انتقال فرمایا اور خواجہ کلاں والے مکان کے بیرونی حصے میں اپنے والدین سے متصل مدفون ہوئے۔

کلیم الدین احمد نے ۱۹۳۹ء میں اپنے والد عظیم الدین احمد کے شعری مجموعہ ''گل نغمہ'' پر مقدمہ لکھا۔۱۹۴۰ء میں ان کی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' شائع ہوئی۔اسی سال ''دائرہ ادب' قائم کر کے رسالہ ''معاصر'' جاری کیا۔ ۱۹۴۲ء میں ''اردو تنقید پر ایک نظر'' اور ۱۹۴۴ء میں ''اردو زبان اور فن داستان گوئی'' منظر عام پر آئی۔۱۹۴۸ء میں ''سائیکوانالائسس اینڈ لٹریری کریٹی سزم'' (Pshyco Analysis and Literary Criticism) نامی کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔۱۹۵۵ء میں سخن ہائے گفتنی چھپی۔۱۹۵۹ء میں دو تذکرے ''تذکرۂ شورش'' اور ''تذکرۂ عشقی'' کی جلد اول اور ''دیوانِ جہاں'' اشاعتی زیورات سے آراستہ ہوا۔۱۹۶۳ء میں عملی تنقید جلد اول اور دو تذکرے حصہ دوم شائع ہوئے۔ان کی ۲۴ نظمیں ۱۹۶۵ء اور ۲۵ نظمیں ۱۹۶۶ء میں منظر عام ہوئیں۔ ۱۹۶۸ء میں ''دیوان جہاں'' دوبارہ شائع ہوا۔۱۹۷۳ء میں انھوں نے ''واجد علی شاہ کے خطوط بیگمات کے نام'' مرتب کر کے ''تاریخ نور'' کے نام سے شائع کیا۔انھوں نے خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' جلد اوّل ۱۹۷۵ء، جلد دوم ۱۹۸۷ء اور جلد سوم دوسری جلد سے پہلے ہی ۱۹۸۲ء میں ہی شائع کر دی تھی۔۱۹۷۵ء میں انھوں نے ''کلیات شاؔد'' کے دو حصے ترتیب دے کر شائع کیے۔انھوں نے ۱۹۷۶ء میں ''دیوانِ جوشش'' کو اپنے رسالے ''معاصر'' میں ''قاضی عبدالودود'' نمبر کے نام سے شائع کیا۔انھوں نے ۱۹۷۷ء میں محمد مسلم عظیم آبادی کے منتخب

کلام کو ''رقصِ شرر'' کے نام سے اور ''مقالاتِ قاضی عبدالودود (حصہ اول)'' کو مرتب کیا۔ ۱۹۷۸ء میں ''کلیاتِ شاذ'' کا حصہ دوم منظرِ عام پر آیا۔ اسی سال انھوں نے ''میری تنقید: ایک بازدید'' کے موضوع پر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ایک خطبہ پیش کیا، جو بعد میں کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آئی۔ ۱۹۷۹ء میں ''ادبی تنقید کے اصول'' چھپی۔ یہ کتاب دراصل ان دو لیکچروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے ۱۹۷۷ء میں سیدین میموریل ٹرسٹ میں دیے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں ہی ان کی دوسری کتاب ''اقبال: ایک مطالعہ'' شائع ہوئی۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اکادمی میں دیے گئے خطبات کو ''قدیم مغربی تنقید'' کے عنوان سے بعد از وفات ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ ۱۹۷۳ء میں ترقی اردو بیورو کی طرف سے ملنے والا پروجکٹ ''جامع انگلش اردو لغت'' کی اشاعت ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں ''مینگ آف کرٹیسزم (Meaning of Criticism) شائع ہوئی۔ ۱۹۸۶ء میں ''فرہنگ ادبی اصطلاحات'' کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ انگریزی کتاب ''آئڈلز'' ۲۰۰۵ء اور اس کا اردو ترجمہ ''اصنام'' ۲۰۰۹ء میں خدا بخش لائبریری نے شائع کیا۔

9.3.2 کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری

کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات مغربی بالخصوص انگریزی ادب کے زیرِ اثر پروان چڑھے۔ ان کی تنقیدی ذہن سازی میں ان کے استاد ایف آر لیوس اور معاصرین میں آئی۔ اے۔ رچرڈس اور ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایف۔ آر۔ لیوس دوٹوک، بے باک، صاف اور براہ راست طرزِ تنقید کے قائل تھے۔ لہٰذا کلیم الدین احمد نے بھی اسی طریقے کو اختیار کیا اور فن پارے کی تعینِ قدر میں ان سے مدد لی۔ چوں کہ ان کا منشائے نقد ہی مغربی اصول وضوابط پر استوار تھا اس لیے انہوں نے مشرقی نظامِ شعر سے چشم پوشی کر کے مغربی اصولوں کی روشنی میں اردو شعر وادب کا تعین قدر کیا جس سے ان کے تنقیدی پیمانے پر اردو شاعری کھری نہ اتر سکی۔ بالفاظ دیگر انھوں نے جن سانچوں (معیار) سے اردو شاعری کا محاکمہ کیا وہ سانچے ہی مشرقی شاعری کے لیے بنیادی طور پر غلط تھے، لہٰذا ان کی تنقید کے تعمیری پہلوؤں میں تخریبی عناصر از خود پیدا ہو گئے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کی تنقید یکسر منفی نوعیت کی ہے، بلکہ ان کے تخریبی عوامل میں بھی تعمیری پہلو مضمر ہیں۔

۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے والد عظیم الدین احمد کی نظموں کا مجموعہ ''گلِ نغمہ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس پر انھوں نے ایک مقدمہ لکھا اور اسی مقدمے سے ان کی تنقید کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اس مقدمے کے پہلے حصے میں اردو شاعری کے متعلق بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں نظموں پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی مقدمے میں ان کا یہ مشہور جملہ ''غزل نیم وحشی صنفِ شاعری ہے'' منظرِ عام پر آیا۔ اس بیان کی وجہ یہ بتائی ہے کہ غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کا فقدان ہے جس کے باعث تہذیب یافتہ ذہن کو لطف اور نہ تربیت یافتہ تخیل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ ''گلِ نغمہ'' کے تقریباً ایک سال بعد ان کی دوسری مشہور کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' ۱۹۴۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب شاعری کی مختلف اصناف کی تنقید پر مبنی ہے۔ اس میں انھوں نے اردو شاعری پر بہت سے

اعتراضات کیے۔تمام اعتراضات کا زیادہ تر تعلق ''تسلسل اور ربطِ مضمون سے ہے۔۱۹۴۳ء میں جب ان کی تیسری کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' آئی تو ادبی دنیا میں ایک طرح کا ہنگامہ بپا ہوگیا، کیوں کہ تذکروں سے لے کر معاصرین تک کی، تنقیدی کاوشوں کو یکسر رد کر دیا گیا۔اردو تنقید کے وجود کو محض فرضی، اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر سے تعبیر کیا گیا۔جس پر ناقدینِ ادب نے اپنا سخت ردِعمل ظاہر کیا۔

ادب سے متعلق کلیم الدین احمد کے اہم تصورات یہ ہیں کہ ادب، انسانی تجربات کا اظہار ہے، جو انسان کے ماحول سے وابستہ ہوتے ہیں، چوں کہ ماحول کا ایک لازمہ تغیر ہے! لہٰذا یہ تجربات بھی بدلتے رہتے ہیں۔اس لیے ان کے نزدیک کسی دور کے ادب کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اس ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ تجربات میں جذبات اور خیالات دونوں شامل ہیں۔تجربے میں محض زندگی کے روزمرہ حقائق ہی نہیں، بلکہ احساسات بھی داخل ہیں۔ان کے نزدیک شاعری بیش قیمتی تجربات کا موزوں ترین اظہار ہے۔وہ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''شاعری اچھے اور بیش قیمت تجربوں کا حسین، مکمل اور موزوں بیان ہے۔سچائی، خلوص اور گہرائی جس کی تین بنیادی شرطیں ہیں۔ان کے اس بیان سے واضح ہوا کہ انھوں نے شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ مشرقی اصولِ شعر سے عبارت ہے۔عربی اور فارسی کے ناقدین نے انسانی تجربوں کے موزوں بیان کو شاعری تسلیم کیا ہے، لیکن یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ انھوں نے اس میں مکمل کی شرط لگا کر اپنے مخصوص زاویۂ نظر کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔جب کہ مشرقی نظامِ شعر میں یہ مسلم ہے کہ شاعری زیادہ تر اشارات و کنایات میں ہی پیش کی جاتی رہی ہے جس کو قاری اپنے تربیت یافتہ ذہن کے ذریعے مکمل کرتا ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ کلیم الدین احمد نے مغربی بالخصوص انگریزی شاعری سے ''مکمل'' کی شرط کو مستعار لیا ہے۔ بحیثیت مجموعی شاعری سے متعلق ان کے تمام تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعری میں پیش کردہ تجربات یا خیالات قیمتی ہوں۔موزونیت، نغمگی اور تناسب ہو۔حسنِ بیان ہو۔خیال میں انفرادیت اور تازگی ہو اور وہ نئے جذبات و احساسات سے پر ہوں۔الفاظ کے پردے میں معنی دھندلے ہونے کے بجائے مکمل ہوں۔تجربات کی پیش کش میں مناسب الفاظ استعمال کیے جائیں تاکہ مفہوم پوری طرح ادا ہو سکے۔ربط ہو اور تسلسل ہو۔

کلیم الدین احمد نے ''ادبی تنقید کے اصول'' کے پہلے لیکچر میں تنقید کی اہمیت، تنقید اور تخلیق کے رشتے اور ادبی تنقید کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ تنقید ادبی ہوتے ہوئے بھی ادبی نہیں ہوتی، سماجی یا اخلاقی بھی ہوتی ہے اور شعور کی تنظیم اور قدروں کے عرفان میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔انھوں نے نقاد کے لیے ادب کے عرفان کے علاوہ علوم سے واقفیت کو بھی بجا طور پر ضروری قرار دیا ہے۔انھوں نے رچرڈس کے الفاظ میں تنظیم، مربوط ذہن اور ذہنی صحت کو عام کرنا، نقاد کا سب سے بڑا کام قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک تجربوں کی تمیز اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کا نام تنقید ہے۔انھوں نے واضح کیا ہے کہ الفاظ کی صحیح تمیز اور ان سے تیزی اور ٹھیک ٹھیک متاثر ہونے کا نام تنقید ہے۔ان کے نزدک فنی کارناموں کی تشریح اور مذاق کی درستگی تنقید کا اصل مقصد

ہے۔ان کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں تنقید پوری فنی تحریک کا جزو ہے۔ یہ آرٹ کی اپنے اوپر ملوکیت کا عمل ہے۔ جیسے آرٹ زندگی کا شعور ہے، تنقید آرٹ کا شعور ہے۔تنقید اور کچھ نہیں، یہ ادبی مذاق کا منطقی عمل ہے، ادب کی جانچ پرکھ کے بعد یہ دیکھنا کہ وہ کون سی چیز ہے جو ادب کو خوشگوار اور اچھا بناتی ہے۔

''ادبی تنقید کے اصول'' کے دوسرے لیکچر میں انھوں نے ''کیا'' اور ''کیسے'' کی بات اٹھائی ہے۔ان کے یہاں ''کیا'' سے مراد مضمون ہے اور ''کیسے'' سے مراد الفاظ ہیں۔ ہیئت/ فارم کے مطالعے کے لیے ان کے یہاں چار چیزیں بنیادی ہیں: اول نقوش، دوم الفاظ، سوم آہنگ یا وزن، چہارم لب ولہجہ۔

نقوش:

نقوش سے ان کی مراد یہ ہے کہ شاعر خیال، ذہنی نقش یا تاثر کی شکل میں جو کچھ کہتا ہے وہ نقوش ہے۔اگر نقوش اعلیٰ درجے کے ہوں اور ان میں تجربے کی باریکی، تازگی اور گہرائی بھی موجود ہو تو اس سے اخذ ہونے والی شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی۔

الفاظ:

''الفاظ'' کے ضمن میں وہ لفظ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے آئی۔اے۔رچرڈس کے نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے یہ حوالہ دیتے ہیں کہ ہر لفظ کا ایک پیکر ہوتا ہے، اسے بولتے ہیں تو اس کی ساخت ہم منہ میں محسوس کرتے ہیں، سننے میں تو خاص صوتی پیکر کا احساس ہوتا ہے، سوچتے ہیں تو آنکھوں کو اس کا صوری پیکر نظر آتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ لفظوں کا ہر مجموعہ شعر نہیں ہوتا۔شعر میں جلا، رنگ، اثر اور انوکھا پن پیدا کرنے کی اساس الفاظ کی حسنِ ترتیب پر مبنی ہے۔اس لیے اچھی شاعری بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب سے ہی وجود پاتی ہے۔

آہنگ یا وزن:

کلیم الدین احمد کے بقول لفظ ہی کے ذریعے شعر کا خاص نقش (پیٹرن) بنتا ہے اور اسی سے آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ وہ آہنگ یا وزن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وزن اور الفاظ کی نثری ترتیب آپس میں ایک کھیل ہوتا ہے۔وزن ہی لفظوں کی نثری ترتیب کو بدلتا ہے۔وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اردو میں بہت سی بحریں ہیں اور سبھی بحروں کی اپنی ایک مخصوص خصوصیت ہے۔وہ فن کار سے تقاضا کرتے ہیں کہ وزن اور لفظ کی ترتیب کے مابین جو مخاصمت ہے وہ اسے دور کرے اور وزن کے ذریعے نثری ترتیب سے زیادہ اچھی اور معنی خیز ترتیب لفظوں میں پیدا کرے۔

لب ولہجہ:

کلیم الدین احمد کے یہاں فن پارے کے مطالعے کی چوتھی سطح لب ولہجہ ہے۔اس ضمن میں ان کا موقف ہے کہ ہر

شاعر اپنا ایک مخصوص لب و لہجہ رکھتا ہے۔ ایک حد تک یہ لب و لہجہ شاعر کی شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔ کیوں کہ شخصیت کے ذریعے ہی تجربوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس لہجے میں شاعر کلام کرتا ہے اس میں اس کی شخصیت کا عکس جھلکتا ہے۔ لب و لہجے کے افتراق کی دلیل میں انھوں نے عملی طور پر میرؔ و سوداؔ کے اشعار کے تجزیے سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ دونوں کے لہجے میں نمایاں فرق ہے۔ میرؔ کا لہجہ نرم اور دھیما ہے جب کہ سوداؔ کا سخت اور بلند ہے۔ البتہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ہی شاعر کے مختلف لب و لہجے ہو سکتے ہیں۔ تجربے کو انھوں نے چشمے سے تشبیہ دے کر واضح کیا ہے کہ جس طرح چشمے کا پانی اپنے نشیب و فراز کی وجہ سے کبھی تیزی سے بہتا ہے، کبھی آہستہ۔ اور کبھی لہریں بلند ہوتی ہیں، کبھی مدھم، ایسے ہی تجربات لہجے کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں۔ انھوں نے میرؔ، غالبؔ، مصحفیؔ، آتشؔ اور داغؔ کے مختلف النوع اشعار سے اس کی دلیل بھی فراہم کی ہے۔

غزل کو ''نیم وحشی صنف شاعری'' قرار دینے اور اس کی ہئیت پر معترض ہونے، اس کی ریزہ خیالی پر ملال کرنے اور موضوعات کے تکرار سے عدمِ اتفاقی کے باوجود کلیم الدین کی غزل تنقید کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ غزل تنقید کے متعلق ان کا پہلا مضمون ''نگار'' لکھنؤ، جنوری تا فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں غزل کے متعلق جو آرا انھوں نے پیش کی تھیں انہیں کو مربوط شکل میں ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں پیش کیا ہے اور پھر اسی روشنی میں انھوں نے غزل، قطعہ، قصیدہ اور مرثیہ جیسی معروف اصنافِ سخن کو زیر بحث لا کر نمائندہ شعرا مثلاً: میرؔ، دردؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، میر حسنؔ، نسیمؔ، شوقؔ، انیسؔ، دبیرؔ وغیرہ کے فن پاروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ غزل کی مخصوص شعریات کو نظر انداز کر کے انھوں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ اکثر غلط اور من مانے ہیں۔ غزل کے موضوعات کے متعلق ان کا خیال ہے کہ غزل کے موضوعات محض عشق حقیقی اور مجازی تک محدود ہیں۔ جن میں تقدس، ریاضتِ نفس، کثرت میں وحدت کا جلوہ، ترکِ دنیا، فقر و قناعت جیسے مضامین کی تکرار ہوتی ہے اور ان میں بھی فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ان کے الفاظ یہ ہیں ''تمام خیالات و مظاہرات فارسی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس لیے اصلیت عموماً عنقا ہے اور اصلیت اگر تھی بھی تو وہ تقلید کے بارگراں کی متحمل نہ ہو سکی۔'' بطور نمونہ حسرتؔ موہانی کے درج ذیل شعر پر کلیم الدین احمد کا تجزیہ دیکھیے:

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شام سواد وطن میں تھی

''پہلے شعر میں مضمون معمولی ہی نہیں عامیانہ بھی ہے۔ اگر کوئی دوسرا شاعر اس کا ترجمان ہوتا تو ترجمانی میں ابتذال کا وجود ممکن تھا۔ دوسرے شعر میں کسی غربت نصیب کے احساس کی ترجمانی ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ یہ احساس

ذاتی ہے۔اس میں اصلیت موجود ہے۔دوسرا شعر مضمون کے لحاظ سے پہلے شعر سے بلند ہے۔اوراس میں کسی قسم کے ابتذال کا احتمال نہیں؛لیکن دونوں شعر کی فضا ایک ہے اوراس فضا کی خصوصیت گداز ہے۔پہلے شعر میں جہاں تک مضمون کا تعلق ہے غمگینی کا وجود نہیں لیکن پھر بھی اثر غم افزہ ہوتا ہے۔''

(سخن ہائے گفتنی،کلیم الدین احمد،۱۹۶۷ء،ص:۴۶۲)

کلیم الدین احمد فن پارے کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے بالعموم فارم/ ہیئت اور موضوع/ خیال دونوں کا سہارا لیتے ہیں۔لیکن ان کے یہاں ہیئتی مطالعہ متن کی تفہیم میں غالب رہتا ہے۔فن پارے کے عیب کی ٹوہ میں رہنا ان کا مخصوص عمل ہے۔البتہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں اس مخصوص عمل میں کمی اور اعتدال پیدا ہوا جس کے سبب بعد کی تحریروں مثلاً:''سخن ہائے گفتنی''،''عملی تنقید''اور''اقبال ایک مطالعہ''میں تنقید کے معتدل نمونے ملتے ہیں۔بہر کیف فن پارے کے مطالعے کے دوران ان کا ارتکاز لفظوں کے نظام سے تجربوں کی نوعیت پر مرکوز رہتا ہے۔مثلاً درد کی مشہور غزل''تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے - جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کس قدر سہل،نرم وملائم،صاف الفاظ میں اپنے جذبات کی ترجمانی ہے۔اظہارِ جذبات میں کوئی دقت نہیں،ہر لفظ اپنی مخصوص جگہ پر کس موزوں طور سے قائم ہے اور ہر لفظ اس قدر شفاف ہے کہ صاف کوائف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔الفاظ کو الگ الگ دیکھیں تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی؛لیکن اس غزل میں دوسرے لفظوں کی مطابقت وموزونی کی وجہ سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی ہے''

(عملی تنقید،کلیم الدین احمد،ص:۱۳۵)

اسی طرح میرؔ کا مشہور مطلع''فقیرانہ آئے صدا کر چلے - میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے'' کی توضیح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بظاہر اس شعر میں کچھ بھی نہیں ہے،نہ شاندار الفاظ ہیں نہ عمیق خیالات ہیں؛لیکن یہ شعر نثر سے کم نہیں۔اس تاثیر کا سبب جذبات کی اصلیت ہے۔''

(عملی تنقید،کلیم الدین احمد،ص:۱۳۵)

مذکورہ مثالوں سے واضح ہوا کہ وہ فن پارے کے تفہیمی مراحل میں تجربات والفاظ میں ناگزیر ربط تلاش کرتے ہیں۔کیوں کہ ان کا موقف ہے کہ شاعر تجربات کی پیش کش کے لیے غیر شعوری طور پر بہترین الفاظ تلاش کرتا ہے

اور پھر وہ اسے عمدہ ترتیب اور مناسبت سے آراستہ کرتا ہے۔ اس لیے ناقد کے لیے ضروری ہے کہ معنی اور جذبات سے علاحدہ ہوکر پہلے الفاظ کی طرف متوجہ ہو؛ کیوں کہ الفاظ ہی ناقد کی رہنمائی کر کے شعر کے محاسن و معائب سے آگاہ کرتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اپنے طریقۂ تنقید میں تقابل اور توازن کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان کا بیشتر تنقیدی سرمایہ موازنے پر مبنی ہے۔ کبھی تو وہ موازنے کے ذریعے استنباطِ نتائج کو مستحکم کرتے ہیں اور کبھی فن پارے کے تجزیاتی مطالعہ کی اساس، تقابل پر قائم کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں بھی انہوں نے انگریزی سانیٹ اور اردو غزل کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے ورڈزورتھ اور دوسرے انگریزی شعرا کا نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو غزل کی تفہیم کے لیے انگریزی سانیٹ کا موازنہ بے محل ہے کیوں کہ دونوں زبانوں کی اپنی ایک مخصوص شعریات ہے۔ اس لیے ان دونوں اصناف کو کسی ایک معیار و میزان پر پرکھا نہیں جاسکتا ہے۔ بہر کیف ان کی تنقید متن فہمی میں تقابل کا خوب سہارا لیتی ہے مثلاً: سوداؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''عالم کا مشاہدہ بھی ذاتی تجربہ ہے۔ داخلی و خارجی نہیں، اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرؔ اور دردؔ ذاتی تجربوں کی نقاشی کرتے ہیں اور سودا کے تجربے مصنوعی ہیں۔ آنکھوں کا دیکھنا اور کانوں کا سننا شخصی تجربے ہیں۔ اصل فرق یہ ہے کہ دردؔ اور میرؔ کے شعروں میں جو درد و جوش ہے وہ سوداؔ کو میسر نہیں۔ سوداؔ کے دیوان میں بھی تاثیر سے بھرے ہوئے اشعار ملتے ہیں لیکن ان کی تاثیر دل کی گریباں گیر نہیں ہوتی۔ ان کے اشعار میں بوقلمونی، جذبات کی رنگا رنگ تصویریں ہیں جو اکثر نگاہ کو خیرہ کرتی ہیں۔

(اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۵۷)

دوسری مثال جوشؔ ملیح آبادی کی مشہور نظم ''جوانی کی رات'' سے دیکھیے۔ جوشؔ کی اس نظم کو نظیرؔ کی ایک نظم کے دو بندوں (مشترک تجربے) سے موازنہ کر کے ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ مثلاً جوشؔ کی نظم کا ایک مصرعہ:

نرگس نیم باز میں رنگِ شراب ناب تھا

اور نظیرؔ کا یہ مصرعہ:

بوس و کنار و جام و مے، عیش و طرب ہنسی خوشی

کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دونوں مثالوں میں ایک ہی قسم کی چیز ہے۔ بات ایک ہی ہے لیکن کہنے کا ڈھنگ الگ الگ ہے۔ نظیر کا ڈھنگ ہندوستانی ہے اور جوش کا ایرانی۔ نظیر کا

اسلوب انفرادی ہے اور جوش کا اسلوب وہی ہے جو غزلوں میں عام طور پر ملتا ہے۔ نظیر کی نظم میں واقعیت اور اصلیت ہے۔ جوش کے تجربے میں اگر اصلیت تھی بھی تو باقی نہیں رہی ہے۔ نظیر کے ہر ہر لفظ سے جذبات کی سچائی ٹپکتی ہے۔ یہی چیز جوش اور بہت سے دوسرے موجودہ شاعروں میں نہیں ملتی۔''

(سخن ہائے گفتنی، کلیم الدین احمد، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۸۔۱۰۷)

مذکورہ اقتباس میں آپ نے دیکھا کہ انھوں نے توضیحاتی اسلوب کے بجائے اشاراتی انداز نقد اختیار کیا ہے۔ یہ ان کی تنقید کا پہلا طریقہ ہے۔ ان کی تنقید کا دوسرا طریقہ تجزیاتی نوعیت کا ہے۔ یہاں انہوں نے وضاحت، استدلال اور تقابل کے ذریعے متن کی مختلف جہتوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ بعض موقعوں پر زیر تجزیہ متن کے جزیاتی نکتوں کو اس قدر کھول کر بیان کیا ہے کہ فن پارے کی تمام تفہیمی پرتیں کھل گئی ہیں۔ مثلاً جب وہ کسی غزل یا نظم کے مصرعوں کو آگے پیچھے کر کے، یا چند مصرعوں کو حذف کر کے دکھاتے ہیں کہ یہ ضروری ہیں اور یہ غیر ضروری۔ یا پھر اسی طرح جب وہ فن پارے میں الفاظ کی تکرار پر گرفت کرتے ہیں، تو وہ ہیئتی طریقِ نقد کے ایک اعلیٰ رمز شناس معلوم ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کلیم الدین احمد نے اولاً تنقید کے مسائل کو زیر بحث لا کر اصول تنقید کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔ دوئماً انھوں نے اپنے مخصوص وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اردو شعر و ادب کا جائزہ لیا۔ سوئماً انھوں نے اردو شعر ادب کے معیار و میزان کو مقرر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ان کی تنقید کے حدود و دائرۂ کار انہیں تین حصوں پر مشتمل ہیں۔

9.3.3 ماحصل

عزیز طلبا و طالبات! مذکورہ گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ کلیم الدین احمد اردو تنقید کی روایت میں ایک معتبر اور منفرد نقاد ہیں۔ منفی پہلوؤں سے قطع نظر انھوں نے شعر و ادب کی اصول سازی کر کے فن پارے کے تفہیمی طریق کار میں گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی، تقابلی اور معروضی طریق نقد سے اردو تنقید کو بروقت تازگی اور بالیدگی عطا کی۔ یہ بھی درست ہے کہ انھوں نے مشرقی تصور شعر اور نظام نقد سے چشم پوشی کرتے ہوئے اردو شعر و ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اردو تنقید میں متنازعہ حیثیت کے حامل نقاد بن کر سامنے آئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تنقید کو سراسر تخریبی نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ انھوں نے تنقید کے تعمیری پہلوؤں کو بھی تشکیل دیا ہے۔ انھوں نے مغربی افکار و نظریات سے استفادہ کرنے کی جس روایت کو قائم کیا تھا اگر اسے نظر انداز کیا جاتا تو شاید اردو تنقید اتنی جلدی اپنے ارتقائی مراحل طے نہیں کر سکتی تھی۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- کلیم الدین احمد کے سوانحی حالات و واقعات سے آگہی حاصل کی۔
- کلیم الدین احمد کے ادبی کارناموں کی جانکاری حاصل کی۔
- شعر و ادب اور تنقید سے متعلق کلیم الدین احمد کے افکار و نظریات سے واقفیت حاصل کی۔
- کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے نمایاں پہلوؤں کی معلومات حاصل کی۔
- کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کی قدر و منزلت سمجھنے کی کوشش کی۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ کلیم الدین احمد کے سوانحی حالات مختصراً تحریر کیجیے۔

۲۔ کلیم الدین احمد کی تنقیدی ذہن سازی میں کن مغربی ناقدین نے اہم کردار ادا کیا؟ بیان کیجیے۔

۳۔ کلیم الدین احمد کا مشہور زمانہ جملہ ''غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے'' کب منظر عام پر آیا؟ واضح کیجیے۔

۴۔ شاعری سے متعلق کلیم الدین احمد کے نظریات کا ماحصل قلم بند کیجیے۔

۵۔ ''لب ولہجہ'' سے متعلق کلیم الدین احمد کے خیالات سپرد قلم کیجیے۔

9.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ کلیم الدین احمد اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں: ''میری پیدائش کا دن منگل، ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء اور وقت ساڑھے چھ بجے شام ہے۔ البتہ میٹرکولیشن کی سند میں ۱۹۰۹ء ہے۔ پیدائشی نام 'رحیم الدین احمد' تھا، اسی نسبت سے گھر میں رحمو بلائے جاتے تھے۔ لیکن جب اسکول میں داخلہ کرانا تھا تو 'کلیم الدین احمد' نام سے داخلہ کرایا گیا۔'' ان کے پیدائش کا مقام خواجہ کلان پٹنہ سٹی تھا اور ان کے خانوادے کا تعلق 'صادق پور' سے تھا۔ ان کے دادا کا نام سید شاہ واعظ الدین احمد تھا۔ کلیم الدین احمد کی والدہ کا نام نفیسہ خاتون تھا۔ ان کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہی ہو گیا تھا۔ کلیم الدین کے بڑے بھائی کا نام نعیم الدین احمد (نمو بھائی) تھا اور بڑی بہن کا نام محمودہ (پھودی) تھا جو چار سال کی عمر میں ہی چل بسی۔ ۱۹۲۸ء میں کلیم الدین احمد کی شادی عبدالحفیظ کی بیٹی حنیفہ بیگم (حنی) سے ہوئی۔ ان کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہی ہو گیا تو کلیم الدین احمد نے ۱۹۴۰ء میں اپنی بڑی سالی زہرہ بیگم سے دوسری شادی کی۔

ان کی تعلیم کا آغاز محلے کی محمدی جان مسجد کے ایک مدرسے ہوا۔ ان کے استاد حافظ عبدالکریم تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۴ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں انگریزی میں آنرز کیا۔ ۱۹۳۰ میں پٹنہ یونیورسٹی سے ہی ایم۔ اے انگریزی میں کیا۔ ۷ ستمبر کو کیمبرج انگلینڈ روانہ ہوگئے۔ وہاں سے ڈگری حاصل کر کے ۱۹۳۳ء میں وطن لوٹے۔ پٹنہ کالج میں ان کی تقرری ہوگئی۔ ۱۹۳۷ء میں بہار ایجوکیشن سروس میں کلاس۔Ist ملا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈی۔ ڈی۔ پی۔ آئی (DDPI) کا عہدہ ملا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوگئے اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے۔ ۱۹۵۸ء میں ڈی۔ پی۔ آئی (DPI) ہوگئے۔ ۱۹۶۴ء میں بہار سکنڈری اسکول اگزامنیشن بورڈ کے اعزازی چیرمین اور بھاگل پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ستمبر ۱۹۶۷ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء تک بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۷۳ء میں انھیں غالب ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں بہار سرکار میں ڈی۔ پی۔ آئی (DPI) مقرر کیے گئے۔ ۱۹۸۰ء میں ''اعزازِ میر'' کی سند سے نوازے گئے۔ ۱۹۸۱ء میں انھیں ''پدم شری'' کا خطاب ملا۔ ۱۹۸۳ء میں پٹنہ میں انتقال ہوا اور اپنے والدین سے متصل مدفون ہوئے۔

۲۔ کلیم الدین احمد کی تنقیدی ذہن سازی میں ان کے استاد ایف آر لیوس اور معاصرین میں آئی۔ اے۔ رچرڈس اور ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایف۔ آر۔ لیوس دوٹوک، بے باک، صاف اور براہ راست طرزِ تنقید کے قائل تھے، اس لیے انھوں نے اسی طریق نقد کو اختیار کیا۔

۳۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے والد عظیم الدین احمد کی نظموں کا مجموعہ ''گلِ نغمہ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس پر انھوں نے ایک مقدمہ لکھا اور اسی مقدمے سے ان کی تنقید کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اس مقدمے کے پہلے حصے میں اردو شاعری کے متعلق بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں نظموں پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی مقدمے میں ان کا یہ مشہور جملہ ''غزل نیم وحشی صنفِ شاعری ہے'' منظرِ عام پر آیا۔

۴۔ شاعری سے متعلق ان کے تمام تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعری میں پیش کردہ تجربات یا خیالات قیمتی ہوں۔ موزونیت، نغمگی اور تناسب ہو۔ حسنِ بیان ہو۔ خیال میں انفرادیت اور تازگی ہو اور وہ نئے جذبات و احساسات سے پر ہوں۔ الفاظ کے پردے میں معنی دھندلے ہونے کے بجائے مکمل ہوں۔ تجربات کی پیش کش میں مناسب الفاظ استعمال کیے جائیں تا کہ مفہوم پوری طرح ادا ہو سکے۔ ربط ہو اور تسلسل ہو۔

۵۔ کلیم الدین احمد کے یہاں فن پارے کے مطالعے کی چوتھی سطح ''لب و لہجہ'' ہے۔ اس ضمن میں ان کا موقف ہے کہ ہر شاعر اپنا ایک مخصوص لب و لہجہ رکھتا ہے۔ ایک حد تک یہ لب و لہجہ شاعر کی شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔ کیوں کہ شخصیت کے ذریعے ہی تجربوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس لہجے میں شاعر کلام کرتا ہے اس میں اس کی شخصیت کا عکس جھلکتا ہے۔ لب و لہجے کے افتراق کی دلیل میں انھوں نے عملی طور پر

میرؔ و سوداؔ کے اشعار کے تجزیے سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ دونوں کے لہجے میں نمایاں فرق ہے۔ میرؔ کا لہجہ نرم اور دھیما ہے جب کہ سوداؔ کا سخت اور بلند ہے۔ البتہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ہی شاعر کے مختلف لب و لہجے ہو سکتے ہیں۔ تجربے کو انھوں نے چشمے سے تشبیہ دے کر واضح کیا ہے کہ جس طرح چشمے کا پانی اپنے نشیب و فراز کی وجہ سے کبھی تیزی سے بہتا ہے، کبھی آہستہ۔ اور کبھی لہریں بلند ہوتی ہیں، کبھی مدھم، ایسے ہی تجربات لہجے کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں۔ جسے انھوں نے میرؔ، غالبؔ، مصحفیؔ، آتشؔ اور داغؔ کے مختلف النوع اشعار سے مبرہن کیا ہے۔

9.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
سبک دوش	:	فراغت، بری الذمہ ہونا، رٹائرمنٹ
مدفون	:	دفن کیا ہوا
منشا	:	غرض و غایت، مرضی
استوار	:	مضبوط، قائم کرنا
چشم پوشی	:	نظر انداز
مضمر	:	پوشیدہ
اساس	:	بنیاد
تعینِ قدر	:	قدر کا مقام مقرر کرنا
یکسر	:	بالکل، سروع سے آخر تک
زاویۂ نظر	:	سوچنے کا انداز، طرز فکر
عرفان	:	شناخت، پہچان، آگہی
استفادہ	:	فائدہ اٹھانا، نفع اٹھانا
مخاصمت	:	دشمنی، عداوت، جھگڑا
افتراق	:	دوری، تفریق
نشیب و فراز	:	اتار چڑھاؤ
ابتذال	:	شاعری کا رقیق انداز
ناگزیر	:	ضروری، لازمی

موقف : نقطۂ نظر، خیال، تصور

قطع نظر : اس کے علاوہ، سوا

بالیدگی : پختگی، ترقی

مبرہن : دلیل سے ثابت کیا ہوا

9.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر : کلیم الدین احمد

۲۔ اردو تنقید پر ایک نظر : کلیم الدین احمد

۳۔ عملی تنقید : کلیم الدین احمد

۴۔ کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ : ابرار رحمانی

۵۔ کلیم الدین احمد: شخصیت اور تنقید نگاری : زیبا محمود

اکائی 10 آل احمد سرور کی تنقید نگاری

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 آل احمد سرور کی تنقید نگاری

10.3.1 آل احمد سرور: حیات وخدمات

10.3.2 آل احمد سرور کی تنقید نگاری

10.3.3 ماحصل

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالوں کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی میں آپ:

- آل احمد سرور کے سوانحی حالات وکوائف سے متعارف ہوں گے۔
- آل احمد سرور کے ادبی کارناموں سے روشناس ہوں گے۔
- آل احمد سرور کے تنقیدی افکار ونظریات سے واقف ہوں گے۔
- آل احمد سرور کی تنقید نگاری کے امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- آل احمد سرور کی تنقید کے معیار ومیزان سے متعارف ہوں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبا/ طالبات! گذشتہ اکائی میں آپ نے کلیم الدین احمد کے حالات وکوائف اور ان کی تنقید نگاری کے اوصاف وامتیازات اور مخصوص طریق کار کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں آل احمد سرور کی تنقید نگاری کو پڑھیں گے۔ آل احمد سرور کا شمار اردو کے ان ناقدین میں ہوتا ہے جنھوں نے مغربی افکار ونظریات کو

اردو میں فروغ دینے کا کام کیا۔لیکن انھوں نے مغربی خیالات کو مرعوب ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اسے رد و قبول کے مرحلے سے گزارنے کے بعد ہی اپنانے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے شعر و ادب کی تفہیم و تقدیر میں اعتدال پسند رویے اپنائے۔

10.3 آل احمد سرور کی تنقید نگاری

10.3.1 آل احمد سرور: حیات و خدمات

آل احمد سرور کی پیدائش ۹ ستمبر/نومبر ۱۹۱۱ء میں بدایوں شہر میں ہوئی۔ان کے والد کرم احمد نے محمڈن اینگلو عربک کالج (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) سے ایف۔اے کرنے کے بعد ڈاک خانے میں ملازمت کر لی تھی۔کرم احمد کے یہاں اٹھارہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے صرف چھ زندہ رہ سکے۔آل احمد سرور ان میں سے تیسرے تھے۔ آل احمد سرور نے اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کا خاندان مصر کے ایک قصبہ فرشور سے ہندوستان آیا تھا۔ان کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر سے ملتا ہے۔ان کے لکڑ دادا مولوی ذکر اللہ شاہ کے والد محمد اشرف اپنے زمانے کے ایک بڑے بزرگ سید آل احمد مارہروی سے بیعت تھے۔انہیں کی مناسبت سے آپ کا نام آل احمد سرورؔ رکھا گیا۔

روایت کے مطابق آل احمد سرور کی بسم اللہ خوانی مولانا عبدالقدیر کے ہاتھوں ہوئی،اس کے بعد انہیں مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ان کے والد کرم احمد چوں کہ ڈاک خانے میں ملازم تھے اس لیے ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا جس کی وجہ سے آل احمد سرور کی تعلیم بھی متاثر ہوتی تھی۔ابھی انھوں نے گلستاں سعدی شروع ہی کیا تھا کہ ان کے والد کا تبادلہ بدایوں سے میرٹھ اور پھر کچھ دنوں بعد پیلی بھیت ہو گیا۔آل احمد سرور نے بدایوں، میرٹھ، بجنور، سیتاپور، گونڈہ، غازی پور جیسے شہروں میں تعلیم حاصل کی۔گونڈہ میں چھٹی جماعت میں چھٹی پوزیشن آنے پر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔۱۹۲۴ء میں انھوں نے وکٹوریہ ہائی اسکول غازی پور کی ساتویں جماعت میں داخلہ لیا اور یہیں سے ہائی اسکول پاس کیا۔اس کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخلہ لیا۔ان کے والد انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، اس وجہ سے انھوں نے سائنس میں داخلہ دلوایا تھا۔لیکن سال دوم میں سیکنڈ ڈویزن سے پاس کرنے کی وجہ سے سائنس سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔وہ آرٹس میں داخلہ لینا چاہتے تھے،لیکن اپنے چچا کے اصرار پر بی ایس سی میں داخلہ لے لیا۔سینٹ جانس کالج آگرہ میں ان کی ملاقات مجاز اور جذبی سے ہوئی۔وہ دونوں بھی ان دنوں اسی کالج میں زیر تعلیم تھے اور اپنی شاعری کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔۱۹۳۲ء میں انھوں نے بی ایس سی سکنڈ کلاس سے پاس کیا۔اس سے انہیں سخت صدمہ پہنچا انہوں نے ارادہ کر لیا کہ سائنس کے بجائے انگریزی میں ایم اے کریں گے۔آل احمد سرورؔ کی خوش قسمتی کہ اس وقت ان کے والد علی گڑھ کے صدر ڈاک خانہ کے پوسٹ ماسٹر

تھے،اس لیے بہ آسانی اگلے سال ہی انھوں نے ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔امتیازی نمبروں سے انھوں نے ایم۔اے پاس کیا۔ڈاکٹر ذاکر حسین کے کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اردو سے ایم۔اے کیا۔ آل احمد سرور کو بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا۔ان کے گھر کا ماحول ادبی اور علمی تھا۔مکتب کے زمانے میں ہی وہ نذیر احمد کے ناول، طلسم ہوش ربا، تاریخ ابن خلدوں اور اردو شعرا کے دواوین والد سے چھپ کر پڑھا کرتے تھے۔وہ اگر چہ سائنس کے طالب علم تھے لیکن سینٹ جانس کالج میں اردو کی ادبی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے، کالج کی ادبی بزم ''انجمن اردوئے معلیٰ'' میں شرکت کیا کرتے تھے۔ان کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں اس انجمن کا سکریٹری بنا دیا گیا تھا۔شاعری کی ابتدا اسکول کے زمانے ہی میں کر دی تھی۔سینٹ جانس کالج پہنچنے کے بعد ان کی شاعری کالج میگزین میں شائع ہوتی تھی۔کالج کی ادبی انجمن کی طرف سے ہر سال ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔انجمن کے سکریٹری ہونے کی وجہ سے ان کی ملاقات اس وقت کے مشہور شعرا سے ہوئی۔ان میں فانؔی بدایونی، مانی جائسی، مخمورؔ اکبر آبادی، میکشؔ اور سیمابؔ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔علی گڑھ پہنچنے کے بعد خواجہ منظور حسین نے انہیں ''علی گڑھ میگزین'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا تھا۔

آل احمد سرور کی ملازمت کا باضابطہ آغاز ۱۹۳۴ء سے ہوا۔شعبۂ انگریزی کے استاد غلام سرور دو سال کی چھٹی لے کر جب انگلستان گئے تو ان کی خالی جگہ پر آل احمد سرور کو عارضی طور پر استاد رکھ لیا گیا۔۱۹۳۶ء میں ان کی تقرری عارضی طور سے شعبۂ اردو میں ہوگئی۔۱۹۳۸ء میں جب سینئر لکچرر مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ پر آپ کا مستقل تقرر ہو گیا۔۱۹۴۴ء تک آپ شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد رہے۔۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے اصرار پر آپ نے انٹر کالج، رام پور کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔۱۹۴۶ء میں ان کا تقرر لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت ریڈر ہوا۔اس وقت سید مسعود حسن رضوی ادیب شعبہ کے صدر تھے۔شعبۂ اردو میں سید احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور سید محمد تقی جیسے اساتذہ موجود تھے۔۱۹۵۴ء میں مسعود حسن رضوی کی سبکدوشی کے بعد انہیں صدر شعبہ بنایا گیا۔۱۹۵۸ء میں رشید احمد صدیقی کی سبکدوشی کے بعد انہیں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا صدر بنایا گیا۔وہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء تک شعبۂ اردو میں صدر کے منصب پر فائز رہے۔ درمیان میں ایک سال کے لیے وہ شکاگو یونی ورسٹی امریکہ میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیے گئے۔۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۷ء کے درمیان انھوں نے کشمیر یونی ورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے طور پر کام کیا۔تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ۹ فروری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔

آل احمد سرور نے مختلف موضوع پر تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں۔'' تنقیدی اشارے''، ''نئے اور پرانے چراغ''، ''تنقید کیا ہے''، ''ادب اور نظریہ''، ''تنقیدی اشارے''، ''نظر اور نظریے''، ''مسرت سے بصیرت تک''، ''دانشور اقبال''، ''اقبالؔ اور ان کا فلسفہ''، ''عکس غالب''، ''عرفان اقبالؔ'' وغیرہ قابل ذکر تنقیدی مجموعے

ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''سلسبیل''، '' خواب اور خلش'' اردو شاعری کا سرمایا ہیں۔ا ن کی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' ادبی دنیا میں کافی مشہور ہوئی۔

10.3.2 آل احمد سرور کی تنقید نگاری

اردو تنقید کی عمارت جن عظیم تنقید نگاروں نے استوار کی ان میں ایک بڑا نام آل احمد سرور کا بھی ہے۔ وہ ایک بلند پایہ نقاد ہیں۔ انھوں نے نظری اور عملی تنقید پر بہت عمدہ کام کیا ہے۔ آل احمد سرور نے کسی موضوع پر مستقل کتاب نہیں لکھی، بلکہ مختلف موضوعات پر مبنی مضامین تحریر کیے ہیں۔ انہیں مضامین کو مختلف کتابوں میں جمع کیا گیا ہے۔ ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ''تنقیدی اشارے'' ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کے ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مضامین حالؔی، شبلؔی، اکبؔر، سرسید، اقبالؔ، سرشارؔ، چکبستؔ، فانؔی، ریاضؔ اور رشید احمد صدیقی جیسی شخصیات پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مضمون ''جدید اردو تنقید'' اور دوسرا ''زہر عشق'' پر شامل ہے۔ یہ مضامین ریڈیو کے سامعین کے مزاج کو سامنے رکھ کر لکھے گئے تھے۔ اس لیے اس میں ٹھوس علمی مضامین کی گنجائش بہت کم نظر آتی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کا نام ''تنقیدی اشارے'' اسی لیے رکھا۔ ان کا دوسرا تنقیدی مجموعہ ''نئے اور پرانے چراغ'' (۱۹۴۶ء) ہے۔ اس مجموعہ کے ذریعے آل احمد سرور کی تنقیدی میدان میں کافی شہرت ہوئی۔ اس میں قدیم وجدید ادیبوں اور شاعروں پر گیارہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب ان کی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ آل احمد سرور کی نظر صرف اردو کے شعری سرمائے پر ہی نہیں تھی بلکہ نثری سرمائے پر بھی تنقیدی نظر مرتکز تھی۔ 'ان کا مجموعہ ''فکر روشن'' اردو کے نثر نگاروں اور نثر پاروں پر کی گئی تنقید کے لیے مخصوص ہے۔ آل احمد سرور کی نظری تنقیدیوں تو ان کی سبھی کتابوں میں مل جاتی ہے لیکن ان کی کتاب ''نظر اور نظریے'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کے تمام مضامین نظریاتی مباحث کے لیے مختص ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے ادب سے متعلق اہم سوالوں کے جواب دیے ہیں۔ مثلاً: ''شاعری میں شخصیت''، ''نظم کی زبان''، ''نثر کا اسٹائل''، ''فکشن کیا، کیوں اور کیسے؟''، ''ادب میں اظہار وابلاغ کا مسئلہ''، ''ادب میں جدیدیت کا مفہوم''، ''تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل'' وغیرہ۔ یہ تمام مضامین ان کی ادبی بصیرت اور دانشوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

آل احمد سرور نے شعر وادب کی اصول سازی کے ساتھ ساتھ فن پارے کی عملی تنقید بھی کی ہے۔ جس طرح ان کی نظری تنقید مختلف مجموعوں میں محفوظ ہے اسی طرح ان کی عملی تنقید بھی بیشتر مجموعوں میں موجود ہے۔ انھوں نے مختلف ادیبوں، شاعروں اور ادب پاروں پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں جو عملی تنقید کی بہترین مثال ہے۔ بالخصوص انھوں نے غالبؔ اور اقبالؔ پر خوب لکھا ہے۔ غالبؔ پر انھوں نے کئی وقیع مقالے لکھے ہیں جن میں غالبؔ کا نظریۂ شاعری، غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات، غالبؔ اور جدید ذہن، غالبؔ کی شاعری کی معنویت، پورے

غالبؔ خاص طور قابل ذکر ہیں۔ وہ غالبؔ کو ایک شخص ماننے کے بجائے ایک ذہنی فضا سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ تفہیم غالبؔ میں نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت پر خاص طور سے زور دیتے ہیں۔

آل احمد سرور کو اقبالؔ سے بھی خاص لگاؤ تھا، ان کے ہر تنقیدی مجموعے میں اقبالؔ پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور شامل ہوتا تھا۔ ان کے اقبال پر مبنی مضامین ''دانشور اقبال'' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ مجموعۂ مضامین اقبالیات کی ضخیم کتابوں پر اپنی افادیت اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے فائق ہے۔ اس مجموعہ کے علاوہ ''اقبالؔ کے مطالعے کے تناظرات'' بھی اقبال شناسی کا بہترین مجموعہ ہے۔ زہرا معین نے ''عرفان اقبالؔ'' کے نام سے آل احمد سرور کے اقبال پر مبنی مضامین کو ۱۹۷۷ء میں جمع کر کے شائع کیا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اقبالؔ کی فکر اور فن دونوں کو اہمیت دی ہے۔ لیکن ان کا رجحان اقبالؔ کے فکری پہلو کی طرف زیادہ ہے۔ ''نئے اور پرانے چراغ'' میں اقبالؔ پر تین مضامین شامل ہیں۔ انھوں نے اقبالؔ کی نظم ''ابلیس'' کا مقابلہ ملٹن کی نظم ''شیطان'' سے کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبالؔ کی نظم فکری اور فنی سطح پر زیادہ بلند ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ اس کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کی وضاحت کی ہے۔ ادب غیر ادب، ادب اور سماج جیسے موضوعات پر ان کا مخصوص تنقیدی نظریہ ہے، جسے انھوں نے واضح طور سے بیان کیا ہے:

> ''میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں، بعد میں کچھ اور۔ گو یہ جانتا ہوں کہ ادب میں جان زندگی سے ایک گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے۔ میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں نہ اشتراکیت کا پرچار۔ میں محض نیا یا پرانا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ میں نیا بھی ہوں اور پرانا بھی۔ لیکن قدرتی طور پر اپنے دور کے میلانات و خیالات سے متاثر ہوں۔ میں مغربی اصولوں، نظریوں اور تجزیوں سے مدد لینا اُردو ادب کے لیے مفید سمجھتا ہوں۔ مگر اُس کے معنی یہ نہیں لیتا کہ اپنے تہذیبی سرمائے کے قابل قدر حصوں کو نظر انداز کر دوں۔ میں نہ غزل کو نیم وحشیانہ صنف شاعری سمجھتا ہوں اور نہ صرف غزل پر ایمان لانے والا ہوں۔ بلکہ اچھی غزل یا اچھی نظم دونوں کے حسن کا قائل ہوں۔ میں ادبی اصولوں کو اٹل نہیں سمجھتا۔ نہ ادب میں مطلق العنانی یا آمریت کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک تجربوں کی ادب میں ہمیشہ ضرورت ہے اور تخلیق، اختراع اور جدت کی ہمیشہ قدر کرنی چاہیے مگر ہر تجربے پر ایمان نہیں لانا چاہیے۔ میں ترقی پسند تحریک کو ایک مفید، زندہ اور قابل قدر تحریک سمجھتا ہوں۔ مگر میری ترقی پسندی مجھے عریانی، فحاشی، ابہام اور سستے پروپیگنڈے کو ادب سمجھنے سے روکتی ہے۔''
>
> (نئے اور پرائے چراغ: دیباچہ، ادارۂ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۵۵ء، ص: ۷)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اعتدال پسند نقاد ہیں۔ ہر چیز کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ چیزوں کو محض اچھے اور برے کے خانے میں بانٹنا درست نہیں سمجھتے، بلکہ ادب کے لیے مفید اور کارگر ہونے کے پیش نظر دونوں ابعاد کے درمیان اچھی قدروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ سرورؔ کی تنقید پر دو اعتراض ایسے ہیں جو عام طور پر ان کے معترضین پیش کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ اپنا رخ بدلتے رہتے ہیں۔ کسی ایک نظریے پر قائم نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانہ میں وہ ترقی پسندی کی طرف مائل تھے بعد میں جدیدیت کے طرف دار بن کر سامنے آئے۔ اس کا جواب انھوں نے بہت آسان زبان میں دیا ہے کہ ''میں ادبی اصولوں کو اٹل نہیں مانتا'' وہ ادب میں نئے نئے تجربوں اور اس کے نتیجوں کا احترام کرتے ہیں۔ اگر انھیں کوئی نیا نظریہ پسند آیا تو صرف اس وجہ سے اس پر اصرار نہیں کرتے کہ انھوں نے اس سے پہلے اس کے برخلاف کسی دوسرے نظریے کو پیش کیا تھا۔ یہ ان کی تنقید کی اہم خوبی ہے۔ ان کی تنقید پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں قطعیت کی کمی ہے۔ وہ ایک ہی مضمون میں دو متضاد باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جملہ میں ''اقبال شاعر تھے، فلسفی نہیں تھے'' کہتے ہیں تو دوسری جگہ خود اس سے مخالف بات کہتے ہیں۔ ''میں کہہ چکا ہوں کہ اقبال فلسفی تھے۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جب بھی متن پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر مخصوص سیاق ہوا کرتا ہے، اس لیے بظاہر بعض باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔

آل احمد سرور اردو تنقید کو مغرب کی دین مانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں مغربی مفکرین کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ، رچرڈس جیسے مغربی مفکرین سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں ان مفکرین کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مغربی ادب اور مغربی فکر سے استفادے کے معاملے میں ان کا واضح اصول ہے کہ وہ مشرقی سرمائے کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہوئے مغربی ادب کے قابل قدر اور مفید تجربوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ ''مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہوں اور ذہن کے اعتبار سے مغربی۔'' انھوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ رچرڈس نے اچھے نقاد کی جو تین خصوصیات بیان کی ہیں اس پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تین خوبیاں یہ ہیں اول: اس کیفیت ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے۔ دوم: تجربہ اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ سوم: قدروں کا نباض ہونا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے مغرب سے استفادے کے سلسلے میں سرورؔ کا موازنہ اقبالؔ سے کرتے ہوئے لکھا ہے ''مغرب سے استفادے کے باوجود دونوں کی آنکھ مغربی تہذیب اور فکر کی چمک دمک کے سامنے جھکی نہیں۔ ہماری تہذیب میں اقبالؔ پہلے شخص ہیں جو مغرب سے مرعوب نہیں تھے اور اس کے اندھے نکتہ چیں بھی نہیں تھے۔ تنقید کی حد تک یہ کام آل احمد سرورؔ نے انجام دیا۔'' خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اگر ایک طرف مغربی ادب اور مغربی ناقدین سے بھرپور استفادہ کیا ہے تو دوسری جانب انھوں نے اردو تذکروں میں اساتذہ کی

آرا اور اصلاحوں کے تنقیدی شعور کو سراہا بھی ہے۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ وجہی سے لے کر حسرتؔ تک ہر شاعر اور ادیب کے یہاں تنقیدی شعور موجود تھا۔ اردو میں تنقید کی کمی کی بڑی وجہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ تنقید کو دوسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری کے نقاد کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ خود شاعر ہو اسی طرح افسانہ، ڈرامہ اور ناول کے تنقید نگار کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ خود افسانہ نگار یا ڈامہ نگار ہو۔ آل احمد سرور نے اردو کے اہم ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے ادبی تصورات سے بھی کسب فیض کیا ہے۔

آل احمد سرور کسی ایک خاص نظریہ سے وابستگی پسند نہیں کرتے۔ ان کا ماننا ہے کہ نقاد کو ترقی پسند تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید یعنی کسی خانے میں قید نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ کسی ایک نظریہ سے اندھی وابستگی دوسرے کارآمد افکار و نظریات سے استفادے کی راہ کو مسدود کر دیتی ہے۔ وہ ابتدا میں خود بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے لیکن انہوں نے تحریک کے سبھی اصولوں سے مکمل اتفاق نہیں کیا۔ جو اصول انھیں حقیقت کے مزاج کے خلاف نظر آیا اس کو نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ اس پر سخت تنقید بھی کی۔ وہ نئے پن کے جوش میں پرانے ادب کو نظر انداز کرنے یا اس کو کمتر تصور کرنے کو غلط روش قرار دیتے ہیں۔ غزل اور آزاد نظم کے بارے میں بعض ناقدین کی آرا کو انھوں نے تنقید کے صحت مند رویے کے خلاف قرار دیا ہے۔ وہ ادبی تاریخ اور شخصیت و ماحول کی روشنی میں فکر و فن کی قدر و قیمت متعین کرنے پر مصر ہیں۔

قدیم اور جدید تنقید کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ قدیم تنقید ہر شاعر کو علاحدہ علاحدہ دیکھتی تھی، کسی کو یاسیت کا امام، کوئی رجائیت کا پیغمبر اور کوئی صوفی قرار دیا جاتا تھا، لیکن جدید تنقید میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ ماحول کس حد تک تخلیق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جدید تنقید نے خارجیت، واقعیت، سماجی شعور، تمدنی تنقید جیسی اصطلاحوں کو عام کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ نقاد اپنی دنیا کا کولمبس ہے، وہ پڑھنے والوں کو ایسی فضا میں لے جاتا ہے جس کا حسن اس نے دریافت کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کوئی بھی فن اپنی بنیادوں سے بے نیاز ہو کر ترقی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اردو کی قدیم روایات کا پتہ لگانے کے لیے قدیم ادبی سرمائے کا جائزہ لیا۔ قدیم ادب سے لے کر اپنے عہد کے ادب کو سامنے رکھتے ہوئے اردو کے ادبی ارتقا کا پس منظر بیان کیا ہے۔ ان کی نظر قدیم و جدید ادب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر ہے۔ نئی شاعری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''نئی شاعری کی نمایاں خصوصیات قیود فن، فن سے بے پروائی، آزاد یا بے قافیہ نظمیں، عریانی، سماجی مصائب کا رونا، مذہب کی تحقیر، شوخی، قنوطیت، نفسیاتی تجزیے کی کوشش، نئی علامات وغیرہ بتائی جاتی ہیں۔ ان میں سے مذہب کی تحقیر اور عریانی کو میں پہلے لینا چاہتا ہوں کیوں کہ نئے ادب کے دامن پر سب سے بدنما داغ یہی ہیں۔''

(نئے اور پرانے چراغ،ص:۳۵)

وہ اپنے مضمون ''نیا ادبی شعور'' میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارے ادبی شعور کو اور زیادہ جدید اور زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مغربی اور زیادہ بیدار ہونا چاہئے۔'' جدیدیت سے ان کی مراد ماضی سے بے گانگی نہیں ہے۔ وہ ایسے نئے مزاج کو جو آج سے پندرہ بیس سال کے کارناموں کو نظر انداز کرتا ہو، اس کو بھی نظر انداز کرنے کے قابل سمجھتے ہیں۔

آل احمد سرور کی تنقید کی ایک خصوصیت ان کی تخلیقی زبان ہے۔ بہت سے ناقدین نے ان کی اس خوبی کو ان کی کمزوری کے طور پر پیش کیا ہے، لیکن وہ خود تنقید کو کسی تخلیقی ادب سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی تنقیدی تحریروں کی زبان کو عام فہم بنانے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن ادبیت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ تنقید ادب ہی کی ایک صنف ہے اس لیے اس میں ادبیت ہونی چاہیے۔ ان کا بیان ہے کہ ''اگر نقاد اچھی، صحیح، دلکش، واضح اور پر کیف نثر نہیں لکھتا تو اس کے خیالات سے متاثر ہونے والے کم (لوگ) ہوں گے۔'' انھوں نے شعوری طور سے اپنی تنقیدی تحریروں کی زبان و بیان میں دلکشی، جاذبیت اور پر لطفی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان کے تنقیدی مضامین ادبیت سے بھر پور ہیں۔

10.3.3 ماحصل

آل احمد سرور اردو کے ایک بڑے نقاد ہیں۔ حالی کے بعد جن نقادوں نے اپنے تنقیدی نظریات سے اردو ادب کو متاثر کیا ان میں ایک اہم نام آل احمد سرور کا ہے۔ وہ شاعر اور نقاد دونوں تھے۔ ان کی شہرت اردو ادب میں بطور نظریہ ساز ناقد کی ہے۔ ان کی تنقید کی بنیادی خصوصیت اعتدال ہے، معاملہ چاہے مغرب و مشرق سے استفادے کا ہو یا مختلف مکتب فکر کے تنقیدی نظریات سے اخذ و استفادے کا ہو وہ اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ کسی سے مرعوب ہوئے بغیر اپنے مطلب کی چیزیں اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ تنقید میں تخلیقیت کی آمیزش کے قائل ہیں یعنی وہ تنقید کے لیے بھی دلکش پیرایہ اظہار کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت تازہ دم رہنے کی تائید کرتے ہیں۔ ہر نئی اور کارآمد چیز کے استقبال کے لیے خود کو تیار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں وقت کے ساتھ نظریات میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ادب میں آمریت کے قائل نہیں ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ادبی اقدار کے پیش نظر شعر و ادب پر تنقید کی۔ انھوں نے بیشتر اصناف نظم و نثر اور ان سے متعلق متعدد شعرا اور ادبا پر گفتگو کی ہے۔ غالب اور اقبال ان کی تنقید کے خاص موضوع ہیں۔ انھوں نے متعدد موقعوں پر ان دونوں شخصیات پر مختلف زاویے سے بہت سے مضامین تحریر کیے ہیں۔ بحیثیت مجموعی آل احمد سرور کی تنقید اپنے مخصوص نظریہ و عمل کے باعث ہمیشہ انفرادیت کا مظہر رہی۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- آل احمد سرور کی حیات وخدمات سے آگہی حاصل کی۔
- آل احمد سرور کے تصورات وخیالات کی معلومات حاصل کی۔
- آل احمد سرور کے نظریۂ نقد اور اس کے طریق کار سے آگاہی حاصل کی۔
- آل احمد سرور کی تنقید نگاری کے امتیازی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کی۔
- آل احمد سرور کی تنقید نگاری کے مقام ومرتبے کو سمجھنے کی کوشش کی۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ آل احمد سرور کے خاندانی پس منظر کو مختصراً تحریر کیجیے۔

۲۔ آل احمد سرور کی ملازمت سے متعلق ایک نوٹ لکھیے۔

۳۔ آل احمد سرور کے چند اہم تنقیدی مجموعوں کے نام بیان کیجیے۔

۴۔ آل احمد سرور کی اقبال تنقید پر مختصر اظہار خیال کیجیے۔

۵۔ مغربی استفادے سے متعلق آل احمد سرور کا کیا نظریہ ہے؟ واضح کیجیے۔

10.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ آل احمد سرور نے اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کا خاندان مصر کے ایک قصبہ فرشور سے ہندوستان آیا تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر سے ملتا ہے۔ ان کے لکڑ دادا مولوی ذکراللہ شاہ کے والد محمد اشرف اپنے زمانے کے ایک بڑے بزرگ سید آل احمد مارہروی سے بیعت تھے۔ انہیں کی مناسبت سے آپ کا نام آل احمد سرورؔ رکھا گیا۔

۲۔ آل احمد سرور کی ملازمت کا باضابطہ آغاز ۱۹۳۴ء سے ہوا۔ شعبۂ انگریزی کے استاد غلام سرور دو سال کی چھٹی لے کر جب انگلستان گئے تو ان کی خالی جگہ پر آل احمد سرور کو عارضی طور پر استاد رکھ لیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی تقرری عارضی طور سے شعبۂ اردو میں ہوگئی۔ ۱۹۳۸ء میں جب سینئر لکچرر مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ پر آپ کا مستقل تقرر ہوگیا۔ ۱۹۴۴ء تک آپ شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد رہے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے اصرار پر آپ نے انٹر کالج، رام پور کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔

۱۹۴۶ء میں ان کا تقرر لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت ریڈر ہوا۔ اس وقت سید مسعود حسن رضوی ادیب شعبہ کے صدر تھے۔ شعبۂ اردو میں سید احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور سید محمد تقی جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ۱۹۵۴ء میں مسعود حسن رضوی کی سبکدوشی کے بعد انہیں صدر شعبہ بنایا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں رشید احمد صدیقی کی سبکدوشی کے بعد انہیں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا صدر بنایا گیا۔ وہ ۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء تک شعبۂ اردو میں صدر کے منصب پر فائز رہے۔ درمیان میں ایک سال کے لیے وہ شکاگو یونی ورسٹی امریکہ میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۷ء کے درمیان انھوں نے کشمیر یونی ورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے طور پر کام کیا۔

۳۔ آل احمد سرور کے تنقیدی مجموعوں میں ''تنقیدی اشارے''، ''نئے اور پرانے چراغ''، ''تنقید کیا ہے''، ''ادب اور نظریہ''، ''تنقیدی اشارے''، ''نظر اور نظریے''، ''مسرت سے بصیرت تک''، ''دانشور اقبال''، ''اقبالؔ اور ان کا فلسفہ''، ''عکس غالب''، ''عرفان اقبالؔ'' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۴۔ آل احمد سرور کو اقبالؔ سے خاص لگاؤ تھا، ان کے ہر تنقیدی مجموعے میں اقبالؔ پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور شامل ہوتا تھا۔ ان کے اقبال پر مبنی مضامین ''دانشور اقبال'' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ مجموعۂ مضامین اقبالیات کی ضخیم کتابوں پر اپنی افادیت اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے فائق ہے۔ اس مجموعہ کے علاوہ ''اقبالؔ کے مطالعے کے تناظرات'' بھی اقبال شناسی کا بہترین مجموعہ ہے۔ زہرا معین نے ''عرفان اقبالؔ'' کے نام سے آل احمد سرور کے اقبال پر مبنی مضامین کو ۱۹۷۷ء میں جمع کر کے شائع کیا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اقبالؔ کی فکر اور فن دونوں کو اہمیت دی ہے۔ لیکن ان کا رجحان اقبالؔ کے فکری پہلو کی طرف زیادہ ہے۔ ''نئے اور پرانے چراغ'' میں اقبالؔ پر تین مضامین شامل ہیں۔ انھوں نے اقبالؔ کی نظم ''ابلیس'' کا مقابلہ ملٹن کی نظم ''شیطان'' سے کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبالؔ کی نظم فکری اور فنی سطح پر زیادہ بلند ہے۔

۵۔ آل احمد سرور اردو تنقید کو مغرب کی دین مانتے ہیں۔ ان کی تنقید میں مغربی مفکرین کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ، آئی۔ اے۔ رچرڈس جیسے مغربی مفکرین سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں ان مفکرین کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مغربی ادب اور مغربی فکر سے استفادے کے معاملے میں ان کا واضح اصول ہے کہ وہ مشرقی سرمائے کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہوئے مغربی ادب کے قابل قدر اور مفید تجربوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ ''مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہوں اور ذہن کے اعتبار سے مغربی۔'' انھوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ رچرڈس نے اچھے نقاد کی جو تین خصوصیات بیان کی ہیں اس پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تین خوبیاں یہ ہیں اول: اس کیفیت ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے۔ دوم: تجربہ اور

تجربات میں امتیاز کرنا تا کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ سوم: قدروں کا نباض ہونا۔

10.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
دواوین	:	دیوان کی جمع
آمیزش	:	ملاوٹ
خارجیت	:	بیرونی طور پر ہونے والے احساسات، شعر میں محبوب کے سراپا وغیرہ کا ذکر جو اظہار جذبات پر حاوی ہو
دانشور	:	مفکر، عالم
عملی تنقید	:	کسی ادبی یا تنقیدی نظریے کی روشنی میں کسی فنکار یا فن پارے کا تنقیدی مطالعہ
نظری تنقید	:	تنقید کی وہ قسم جس میں تنقید کے اصول وضوابط وغیرہ سے بحث کی جائے
کسب فیض	:	فائدہ حاصل کرنا
مختص	:	خاص کیا گیا
مرتکز	:	جمع ہونا
سبک دوشی	:	رٹائرمنٹ، فرائض منصبی سے الگ ہونا
استوار	:	مظبوط
وقیع	:	باوقعت
فائق	:	برتر
اختراع	:	ایجاد، جدت
قطعیت	:	علاحدگی، حتمیت
نباض	:	مہارت رکھنے والا
مسدود	:	موقوف، رُکا ہوا
مصر	:	اصرار کرنے والا
تحقیر	:	حقارت، بے قدری
جاذبیت	:	جذب کرنے کی صلاحیت، کشش

10.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ پروفیسر آل احمد سرور حیات اور ادبی خدمات: عابد النسا

۲۔ ارمغان سرور : اصغر عباس

۳۔ آل احمد سرور کی ادبی خدمات : اظہار احمد

۴۔ آل احمد سرور: نقد و نظر : اخلاق آہن/سجاد اختر

۵۔ آل احمد سرور (مونوگراف) : امتیاز احمد

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 11 سید احتشام حسین کی تنقید نگاری

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 سید احتشام حسین کی تنقید نگاری

11.3.1 سید احتشام حسین: حیات وخدمات

11.3.2 سید احتشام حسین کی تنقید نگاری

11.3.3 ماحصل

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 سوالوں کے جوابات

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی میں آپ:

- سید احتشام حسین کے سوانحی حالات وکوائف سے واقف ہوں گے۔
- سید احتشام حسین کی ادبی خدمات سے آگاہ ہوں گے۔
- سید احتشام حسین کے تنقیدی افکار ونظریات سے متعارف ہوں گے۔
- سید احتشام حسین کی تنقید نگاری سے روشناس ہوں گے۔
- تنقیدی میدان میں سید احتشام حسین کی عظمت سے واقف ہوں گے۔

11.2 تمہید

عزیز طلبا/ طالبات! گذشتہ اکائی میں آپ نے معتدل نقطۂ نظر کے حامل نظریہ ساز نقاد آل احمد سرور کی تنقید نگاری سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ آل احمد سرور بیسویں صدی کے وہ نقاد ہیں جنھوں نے مغربی تنقیدی سرمائے

سے مستفید ہوتے ہوئے بھی مشرقی تنقیدی اقدار سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا۔اب آپ زیرِنظر اکائی میں انہیں کے معاصر سید احتشام حسین کی تنقید نگاری کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں گے۔احتشام حسین اردو کے ایک اہم نقاد ہیں۔ترقی پسند ناقدین میں سید احتشام حسین کا مقام بہت بلند ہے۔ان کی تنقید مارکسی تصورِ نقد کی ترجمان ہے۔ترقی پسند ناقدین کے جارحانہ تنقیدی رویے کے برعکس انھوں نے اپنی تنقید میں اعتدال پسندی کو برقرار رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں دیگر ترقی پسند ناقدین کی کھوکھلی نعرے بازی اور شدت پسندی کے بجائے اعتدال وتوازن کا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔

11.3 سید احتشام حسین کی تنقید نگاری

11.3.1 سید احتشام حسین: حیات وخدمات

سید احتشام حسین ۲۱/اپریل ۱۹۱۲ء کو اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے قصبے 'ماہل' میں پیدا ہوئے۔ ماہل ان کا آبائی وطن ہے۔مگر اپنی اصل جائے پیدائش کے بارے میں احتشام حسین لکھتے ہیں کہ ''پیدائش بھی خاص ماہل میں نہیں ہوئی بلکہ وہاں سے کوئی بارہ میل دوری پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔ ماہل میں طاعون تھا اور میرا خاندان دو تین مہینوں کے لیے وہیں منتقل ہو گیا تھا۔کچھ زمین داری کا سلسلہ تھا میں وہیں پیدا ہوا۔گاؤں کا نام تھا'' اتر ڈیہہ''، ضلع جونپور'' (احتشام حسین نمبر: ماہنامہ فروغ اردو، فروری ۱۹۷۴، ص:۴۴)۔اس بیان کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ احتشام حسین کی اصل جائے پیدائش ڈیہہ، جونپور ہے۔احتشام حسین کا بچپن اپنے پھوپھا پھوپھی کے ساتھ گزرا۔تقریباً ڈھائی یا تین برس کی عمر سے اپنے پھوپھا پھوپھی کے ساتھ چھ سات سال کی عمر تک بنارس اور گورکھ پور میں رہے۔ان کے پھوپھا سید محمد قاسم پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے۔اصولوں کے بہت سخت مگر صاحب کردار آدمی تھے۔قرآن مجید، اردو، فارسی، ریاضی اور دینیات وغیرہ کی تعلیم ان ہی کے زیرِ سایہ مکمل ہوئی۔۱۹۱۹ء میں ان کا تبادلہ کسی دور دراز علاقے میں ہونے کی وجہ سے والدین نے احتشام حسین کو واپس اپنے پاس بلا لیا اور 'ماہل' کے ایک مدرسے میں داخل کرا دیا جہاں انھوں نے چھ سال تک اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔اسی درمیان ان کو ہندی اور انگریزی سے بھی تھوڑی بہت شدھ بدھ ہو گئی۔ ماہل چھوٹا سا قصبہ ہونے کے باوجود بھی ادبی ومذہبی سرگرمیوں کے لیے جانا جاتا تھا۔حالاں کہ ان کے گھر کا علمی وادبی ماحول بہت رچا ہوا نہیں تھا۔احتشام حسین کے والد سید ابوجعفر کا تعلق زمین داری سے تھا جس کی وجہ سے وہ مقدمے بازیوں اور زمین داری کے مسائل میں الجھے رہتے تھے۔لیکن جب کبھی انھیں سفر کا موقع ملتا تھا تو واپسی میں بھارتی بک ڈپو سے جاسوسی ناول یا شعروادب سے متعلق کتابیں خرید کر لاتے۔احتشام حسین کو بچپن سے مطالعے کا شوق تھا۔ان کے گھر پر فارسی شعروادب اور مذہبی کتابیں بھی موجود تھیں، اس لیے ہر قسم کی کتاب پڑھنا ان کی عادت میں شمار ہو گیا تھا۔ ماہل میں بہ طور خاص محرم کے دنوں میں مجلسیں ہوتی تھیں جن میں مراثی اور مذہبی تقریریں سننے کا موقع ملتا تھا۔اس کے علاوہ ماہل میں اکثر مشاعرے بھی ہوتے رہتے تھے جن میں

اعظم گڑھ، بنارس اور فیض آباد وغیرہ کے شعرا شرکت کرتے تھے۔ یوں کم عمری میں ہی احتشام حسین کو شعر و ادب سے اچھا خاصا شغف پیدا ہو گیا تھا۔

۱۹۲۶ء میں مڈل کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کیا۔ ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد ان کا داخلہ آسٹریلین مشن کے مشہور تعلیمی ادارے ویسلی، اعظم گڑھ میں ہو گیا۔ مشنری اسکول میں اپنی ذہنی استعداد اور اساتذہ کی رہنمائی سے ان کی صلاحیتوں کے جوہر سب پر کھلنے لگے اور بہت جلد ان کا شمار اسکول کے ہونہار طالب علموں کی فہرست میں کیا جانے لگا۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو اپنے والد کے اصرار پر ان کے ساتھ کلکتہ چلے گئے۔ کلکتہ شہر کی چمک دمک، تہذیبی ماحول اور صنعتی ترقی ماہل سے بالکل مختلف تھی۔ کلکتہ شہر ان کی طرز فکر میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ تقریباً ایک برس تک کلکتہ میں رہنے کے بعد ان کے والد صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انھوں نے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور احتشام حسین اپنے والد صاحب کے پاس ماہل واپس آ گئے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ معاشی حالات بہت اچھے نہیں تھے۔ گھر میں بڑے ہونے کی وجہ سے ان کے سر پر گھریلو ذمہ داریاں آ پڑیں۔ اس کے باوجود بھی انھوں نے سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھنے کا مصمم ارداہ کر لیا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج الہٰ آباد میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت الہ آباد میں سیاسی جدوجہد اور آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بدیسی اور خاص کر برطانوی سامان کا بائکاٹ، ستیہ گرہ اور سیاسی چہل پہل اپنے شباب پر تھی۔ نوجوان بڑھ چڑھ کر تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ ایسے میں احتشام حسین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے سیاسی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کر دیا مگر ادبی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

بارہویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد جولائی ۱۹۳۲ء میں بی۔ اے کرنے کی غرض سے الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور اپنے لیے انگریزی لٹریچر، تاریخ اور اردو ادب جیسے مضامین منتخب کیے۔ مطالعہ وسیع ہوا تو لکھنے کا شوق بیدار ہو گیا اور بی۔ اے کرنے کے دوران ہی انھوں نے مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ ستمبر ۱۹۳۲ء میں ان کا سب سے پہلا سیاسی مضمون جس کا عنوان ''وزیر اعظم کا مایوس کن فیصلۂ ثالثی'' اخبار 'سرفراز' لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے مضامین، مقالات اور افسانے لکھنؤ کے معتبر رسائل و جرائد مثلاً: حریم، مریخ، نظارہ، نگار وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔ کالج کی طرف سے بی۔ اے میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر ''چنتامنی گھوش'' میڈل عطا کیا گیا۔

احتشام حسین جدید اردو شاعری کے بانی فراق گورکھ پوری اور اعجاز حسین سے بے حد متاثر تھے۔ ان سے شعر و ادب کے منظر نامے پر گفتگو کرتے اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایم۔ اے (انگریزی) میں بھی اول نمبر

حاصل کیے اور انھیں یونیورسٹی کا سب سے بڑا اعزاز ''امپریس وکٹوریہ گولڈن جبلی میڈل'' سے نوازا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لے لیا، مگر اسی دوران ۱۹۳۸ء میں ان کا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی میں بہ حیثیت لیکچرار ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۶۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

احتشام حسین ترقی پسند نظریات پر مشتمل تنقیدی مضامین کی بدولت ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔ ملک کے معیاری رسائل میں ان کے مضامین تواتر سے چھپنے لگے۔ ''تنقیدی جائزے'' احتشام حسین کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۴ء میں ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مختلف النوع موضوعات پر بارہ مضامین شامل ہیں۔ ''روایت اور بغاوت'' احتشام حسین کا دوسرا تنقیدی مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں ادارہ اشاعت اردو سے اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں سرفراز پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ''ادب اور سماج'' گیارہ مضامین پر مشتمل احتشام حسین کا تیسرا تنقیدی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ ''تنقید اور عملی تنقید'' تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں خاصا معروف رہا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے بیشتر مضامین عملی تنقید کے بہترین نمونوں پر مشتمل ہیں۔ ''ذوقِ ادب اور شعور'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مختلف موضوعات پر تقریباً سولہ مضامین شامل ہیں۔ جن کا تعلق زیادہ تر شاعری سے ہے۔ ''افکار و مسائل'' ۱۹۶۳ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس میں ۲۵ مضامین ہیں جن کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا زمرہ ''قومی وحدت'' کے عنوان سے ہے۔ دوسرے زمرے کا عنوان 'نقوشِ ادب' ہے۔ تیسرے زمرے میں 'تاثرات' کے عنوان کے تحت دس مضامین شامل ہیں۔ ''عکس اور آئینے'' چودہ مضامین پر مشتمل اہم تنقیدی مجموعہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شاعری سے متعلق سات مضامین اور بقیہ مضامین کا تعلق نثری ادب سے ہے۔ ''اعتبارِ نظر'' ان کے تنقیدی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ ''مقدمے کے طور پر'' عنوان سے درج ہے۔ ''جدید ادب منظر پس منظر'' اتر پردیش اردو اکادمی سے ۱۹۷۸ء میں احتشام حسین کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جعفر عسکری نے شائع کروایا۔ اس مجموعہ میں وہ مضامین شامل ہیں جو احتشام حسین کی زندگی میں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے، مگر ان کے کسی مجموعے کا حصہ نہیں تھے۔ تقریباً اکیس مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ ہے ان کے علمی نظریات اور ندرتِ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔

احتشام حسین کو اگست ۱۹۵۳ء میں ''راک فیلر فاؤنڈیشن فیلوشپ'' پر امریکہ آنے کا دعوت نامہ دیا گیا۔ اپنے احباب اور عزیزوں و اقارب سے مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سفر کے

دوران انھیں امریکہ اور یورپ کے بڑے بڑے پروفیسروں، نقادوں اور ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اس سفر کی دلچسپ روداد انھوں نے اپنے سفر نامے ''ساحل اور سمندر'' میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ انھوں نے درس و تدریس کے علاوہ بہت سی ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں کے ممبر کی حیثیت سے بھی اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یکم/دسمبر ۱۹۷۲ء کو الہٰ آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔

11.3.2 سید احتشام حسین کی تنقید نگاری

احتشام حسین نے تنقید نگاری کا سفر اس وقت شروع کیا جب ترقی پسند تحریک اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کے اصول و نظریات کو مزید مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی تنقید کی بنیاد تو مارکسی اصولوں پر رکھی مگر ماضی کی مثبت اقدار اور ادبی روایات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی تنقید نگاری کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مارکسی تنقیدی نظام کے اہم نکات کو سمجھ لیا جائے۔ مثلاً مارکسی تنقید میں انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر زور دیا جاتا ہے۔ معاشرتی، معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ اسلوب سے زیادہ مواد سے بحث کی جاتی ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک اچھا ادب وہی ہوگا جو زندگی کی ترجمانی کرتا ہو اور انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ ہو۔ دراصل مارکسی تنقید کا سارا دارومدار داخلیت کے بجائے مادیت پر قائم ہے۔

احتشام حسین نے جب تنقید نگاری کی شروعات کی تو اس وقت مجنوں گورکھ پوری اور اختر حسین رائے پوری کے تنقیدی مجموعے منظر عام پر آ چکے تھے جس میں مارکسی تصورات کے تحت تنقید کو پروپیگنڈے کے طور سے استعمال کیا گیا تھا۔ اس سیاق میں دیکھا جائے تو احتشام حسین کی تنقیدی نگارشات میں اعتدال پسندی اور گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف کا از سر نو جائزہ لیا اور ایک ایسا واضح اور مربوط تنقیدی نظام پیش کیا جس کو دوسرے ترقی پسند ناقدین پیش کرنے سے قاصر تھے، اس لیے انھیں ترقی پسند نقادوں میں امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں سماجی علوم اور ادب سے وابستہ دوسرے امور کو شامل کر کے عملی طور پر شعر و ادب کے بنے بنائے ڈھانچوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ اردو کے مشہور نقاد ابوالکلام قاسمی نے احتشام حسین کے تنقیدی انداز کو توسیعی اندازِ نقد کا نام دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس طرح کی تنقید کو وسعت مطالعہ پر ضرور محمول کیا جاتا ہے اور ایسے انداز نقد کو توسیعی انداز نقد کا نام دیا جا سکتا ہے۔''

(احتشام حسین کے تنقیدی رویے، سہ ماہی آمد، جنوری تا مارچ، ۲۰۱۳ء، ص: ۳۵)

احتشام حسین نے تنقید کی ماہئیت ،تنقید کے اصول اور ماضی کے ادب پر تنقید کی ضرورت کو محسوس کیا اور اصولی و نظری مباحث پر متعدد مضامین لکھے۔اس نوع کے مضامین میں انھوں نے تنقید کے منصب اور ادبی تنقید کے مصرف پر اہم گفتگو کی ہے۔

احتشام حسین نے اپنے تنقیدی نظریات کو مقدموں، دیباچوں ،تقاریر،تبصروں اور بہ طور خاص اپنے تنقیدی مضامین میں کھل کر بیان کیا ہے۔اصول نقد،ادبی تنقید کے بنیادی مسائل ،تنقید اور ادبی تنقید،اردو تنقید اور جدید ذہن ، ماضی کا ادب اور نئے تنقیدی ردعمل ان کے ایسے مضامین ہیں جن سے نظریاتی تنقید کی جامعیت اور وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔انھوں نے تنقید کی ماہیت،تنقید کے اصول، اور ماضی کے ادب پر تنقید کی ضرورت کو محسوس کیا اور اصولی ونظری مسائل پر متعدد مضامین لکھے۔اس نوع کے مضامین میں انھوں نے تنقید کے منصب اور ادبی تنقید کے حوالے سے نہایت اہم گفتگو کرتے ہوئے بعض کارآمد نتائج برآمد کیے ہیں،مثلاً:

> ''ادب کا مطالعہ سیدھے طریقے پر شروع ہوتا ہے،لیکن پڑھنے والا جس قدر لکھنے والے کے جذبات اور خیالات، تجربات اور افکار میں شریک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مطالعہ معنی خیز ہوتا جاتا ہے۔یہ معنی خیزی مختلف سطحیں رکھتی ہے،کسی کے لیے لذت اندوزی اور جمالیاتی حظ کی منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے،کسی کے لیے توسیع شعور اور علم کا ذریعہ بنتی ہے،کسی کے لیے اس سے محض جذبے کی تحریک ہوتی ہے،کسی کے لیے معلومات کا ذریعہ بنتی ہے،شعر وادب کے مطالعے سے معنی تو ہر شخص اخذ کرتا ہے لیکن اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔''

(بحوالہ احتشام حسین کے تنقیدی رویے،ابوالکلام قاسمی،ص:۳۸)

> ''میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے ہیں اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔''

(دیباچہ تنقیدی جائزے،ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد،۱۹۴۴ء،ص:۱۱۰)

مزید ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر ہم فن اور ادب کے عام تصور کو پیش نظر رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ادب لکھنے والے کے شعور اور خیالات کا وہ اظہار ہے جسے وہ سماج کے دوسرے افراد تک پہچانے کے لیے ایسے فنی ذرائع سے نمایاں کرتا ہے جسے وہ سمجھ سکیں اور فن سے لطف حاصل کر سکیں۔اگر فن اور ادب کی یہ نوعیت نہ ہوئی اور اس سے محض وہ اظہار مراد لیا گیا جو فن کار

کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور سماجی اظہار کا محتاج نہیں رہتا تو پھر تنقید کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔''

(تنقید اور عملی تنقید۔ اتر پردیش اردو اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۷۔۱۶)

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ احتشام حسین ایسے ادب کے قائل ہیں جو سماجی زندگی کے اظہار پر مبنی ہو اور محض لطف و انبساط کا وسیلہ نہ ہو۔ وہ سماجی سروکار کے بغیر پورے تنقیدی نظام پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ نظریاتی اعتبار سے سماجی و معاشرتی نقاد ہیں۔ جو ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ وہ جذبات و احساسات کے ساتھ اسلوب اور ہیئت کی تبدیلیوں کو بھی سماجی و معاشرتی زندگی کی تبدیلیوں کا نام دیتے ہیں۔ مارکسی نقادوں کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ جمالیاتی اقدار کو اہمیت کا حامل نہیں سمجھتے اور معاشرتی، تہذیبی، سیاسی و سماجی پہلوؤں پر سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں احتشام حسین دیگر ترقی پسند نقادوں سے تھوڑے مختلف نظر آتے ہیں۔ ادب کی جمالیات کے ساتھ اس کی سماجی اہمیت کو ایک دوسرے کے لیے ضروری خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ادب کی جمالیاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی اہمیت کو دیکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ادب زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کتاب کی ادبی اہمیت کے دوش بہ دوش اس پہلو کو بھی دیکھنا ضروری ہے جس میں طبقاتی اور دوسرے رجحانات سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں رجحانات جذبات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔''

(تنقیدی جائزے، ادارۂ اشاعت اردو، ۱۹۴۴ء، ص: ۱۲۰۔۱۱۹)

احتشام حسین نے اپنے تنقیدی مضامین میں متعدد جگہ جمالیاتی اصول و نظریات سے بحث کی ہے۔ وہ جمالیاتی احساس کے قائل ہیں مگر اسے زندگی کے رشتوں سے پیوست سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ ادب کو محض تصوراتی نہیں سمجھتے اور نہ ہی اسے زندگی کے مسائل سے علاحدہ کوئی اور چیز سمجھنے کو تیار ہیں۔

احتشام حسین کے تنقیدی نظریات میں لچک پائی جاتی ہے۔ دراصل ہر دور میں زندگی اور ادب کے تقاضے، ماحول اور طبقات میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ ایک ہی قسم کے اصول و نظریات کا پابند ہو جانا تنقیدی اصولوں کے خلاف ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ احتشام حسین تاریخ، نفسیات، معاشیات، فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں اصولِ نقد متعین کرتے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں مختلف تنقیدی دبستانوں کے اصول و نظریات کو قبول کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لیکن ایک خاص قسم کی فلسفیانہ ہم آہنگی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ

ادب اور تنقید کی صالح قدروں پر زور دیتے ہیں اور اشتراکی ادب اور تنقید کے بعض شدت پسند نظریات سے انحراف کر کے اعتدال و توازن کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی سبب ادبی حلقوں میں احتشام حسین کو قابل اعتنا ترقی پسند ناقد تصور کیا جاتا ہے۔

عملی تنقید کے حوالے سے ترقی پسند نقادوں میں سب سے معتبر نام احتشام حسین کا ہے۔ ان کی عملی تنقید کی اہمیت کا اندازہ ان کے مختلف مضامین سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں انھوں نے قدیم و جدید ادب کا تجزیہ کر کے ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے پانچ درجن سے زیادہ مضامین میں عملی تنقید کی کارفرمائی ملتی ہے۔ غالب کی بت شکنی، اردو تنقید حالی اور ان کا عہد، اقبال بہ حیثیت شاعر و فلسفی، جگر کی شاعری، فیض کی انفرادیت، غزل میں محبوب کا بدلتا کردار اور نئی شاعری کا پس منظر، شعر فہمی وغیرہ عملی تنقید کے بہترین نمونے ہیں۔ ابتدائی دور کی تحریروں میں احتشام حسین کا جھکاؤ نظریاتی تنقید کی طرف نظر آتا ہے مگر جیسے جیسے ان کے اسالیب بیان میں پختگی پیدا ہوتی گئی عملی تنقید کی طرف بھی ان کا رجحان بڑھتا گیا۔ دراصل انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اپنے تنقیدی نظریات کو عملی طور پر پیش کیے بغیر کوئی بھی نقاد کامل نہیں بن سکتا ہے۔ اردو شاعری کے سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو سب سے زیادہ مضامین غالب اور اقبال پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ احتشام حسین نے غالب اور اقبال کے کلام کا فکری و فنی جائزہ لینے کے بعد بعض معنی خیز نتائج اخذ کیے ہیں۔ غالب کی بت شکنی اور غالب کا تفکر جیسے مضامین میں وہ اپنے مخصوص نظریات کے برخلاف غالب کے ان اشعار کا تجزیہ پیش کر کے غالب کو روایت شکن شاعر قرار دیتے ہیں جن کو اس سے پہلے کے نقادوں نے وحدت الوجود اور عارفانہ موضوعات پر مبنی اشعار قرار دے دیا تھا۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے غالب کی ژرف بینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''غالب ان حقیقتوں کی نفی نہیں کر سکتے تھے جو ان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوئی تھیں۔ وہ 'میں' کا بت نہ تو پاش پاش کرنا چاہتے تھے اور نہ ان کے امکان میں تھا کہ مکمل تخریب کر کے کائنات سے زندگی کی آگ بجھا دیں ان کی انفرادیت اور خودستائشی تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہی تھی:
>
> نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
> ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
>
> سوا اپنے اور کوئی سہارا نہ تھا اس لیے ذہنی طاقت سے اس سہارے کو عظیم الشان بنانا چاہتے تھے''

(ادب اور سماج، ادارۂ اشاعت اردو، ۱۹۴۸ء، ص: ۱۱۹۔۱۱۸)

اس طرح احتشام حسین نے روایتی انداز اور عام روش سے ہٹ کر غالب کے اشعار کا تجزیہ پیش کر کے اہل نظر کو چونکا دیا۔ انھوں نے غالب کی شاعری میں احتجاج کی لے کو محسوس کیا اور غالب کو ایک روایت شکن شاعر قرار دیا۔ ''غالب کا تفکر'' نظریاتی اور عملی تنقید کی ہم آہنگی کی عمدہ مثال ہے۔ اردو کے مشہور ناقد آل احمد سرور اور محمد حسن نے اس مضمون کو احتشام حسین کا سب سے بہترین مضمون قرار دیا ہے۔ غالب کے علاوہ انہوں نے تنقیدی نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری پر لکھنے کی ضرورت محسوس کی اور اقبال کی مخالفت و موافقت میں لکھے گئے ادب کا بہ غور مطالعہ کیا۔ ''اقبال بہ حیثیت شاعر و فلسفی''، ''اقبال کی رجائیت'' جیسے مضامین ادبی حلقوں میں ان کے تجزیاتی انداز کے باعث قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ''اقبال بہ حیثیت شاعر و فلسفی'' میں احتشام حسین نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا تعین کرنے کے لیے ان کے ذہنی ارتقا کو زمانی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اقبال کی ذہنی تشکیل میں یورپ کا سفر ایک اہم موڑ ثابت ہوتا ہے۔ وہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں فطرت حسن اور تفکر کو بنیادی خصوصیت قرار دیتے ہیں۔ ان کے تصورات مثلاً خودی اور مرد کامل پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال کی شاعری میں تضادات کی نشاندہی کرتے ہیں اور جگہ جگہ اقبال کی شاعری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اقبال کو اشتراکی شاعر ماننے کے بجائے وہ انہیں کلی طور پر اسلامی شاعر قرار دیتے ہوئے یہ وضاحت کرتے ہیں کہ مارکسی اصول و نظریات پر اقبال کی شاعری کھری نہیں اترتی، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال اشتراکی نظریۂ حیات کے قریب پہنچ جاتے ہیں لیکن انھوں نے سرمایہ داری کی مختلف شکلوں اور طبقاتی سماج سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر گہری نظر نہیں ڈالی۔''

(روایت اور بغاوت، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۷۲ء، ص:۱۱۲)

مگر جہاں انھیں اقبال کی شاعری میں خوبی کا کوئی پہلو نظر آتا ہے وہاں وہ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بات احتشام حسین کی وسیع النظری کا بین ثبوت ہے۔ وہ اقبال کی شاعری میں بھرپور رجائیت اور نشاطیہ رنگ ہونے کو ماننے کے باوجود ان کی رجائیت پسندی پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اقبال کی شاعری کی سب سے بڑی طاقت انسان دوستی اور عظمت انسانی کو قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح حسرت موہانی کی شاعری پر لکھے گئے مضامین ''حسرت کی غزلوں میں نشاطیہ عنصر'' اور ''حسرت کا رنگ سخن''، عملی تنقید کے بہترین نمونے ہیں۔ حسرت کی شاعری میں عشق کے ذاتی تجربات کا بیان، شعر میں سادگی، لطافت اور تازگی کو وہ حسرت کا اپنا رنگ اور انفرادیت قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں احتشام حسین کا یہ اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''ان کے رنگ سخن میں جو آراستگی و شائستگی ہے اس کی مشاطگی صدیوں کے تہذیبی ارتقا

نے کی ہے ان کی غزلوں میں مشرقی تصور محبت کے ڈھانچے میں خود ان کی کامیاب محبت کی تصویریں ہیں۔ روایتی محبوب کے پردے میں خود ان کا اپنا محبوب ہے جس کا حسن الفاظ کی چلمن سے بڑا اچھا لگتا ہے۔ ان کے تجربات عشق میں سنی سنائی یا کتابی باتوں کی جگہ ذاتی تجربات کے نقوش ہیں۔''

(تنقید اور عملی تنقید، اتر پردیش اردو اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۸۸۔۱۸۷)

نظریاتی تنقید کی طرح احتشام حسین کی عملی تنقید میں بھی متنوع رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے شعری ونثری ادب پر جو بھی مضامین لکھے ہیں، ان پر وہ زبردستی اشتراکیت کا لیبل چسپاں نہیں کرتے بلکہ معروضی انداز اختیار کر کے غیر جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ چاہے اختر شیرانی پر لکھا گیا مضمون ہو یا آتش کی صوفیانہ شاعری پر، ہر جگہ اعتدال وتوازن کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔

احتشام حسین نے عملی تنقید میں انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت، سماجی مسائل، تاریخ وعمرانیات پر زور اس لیے دیا ہے کہ وہ مقصدی اور افادی ادب کے قائل تھے۔ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت ادب پڑھنے کے عادی تھے۔ وہ ادب کو زندگی کی دستاویز سمجھ کر پڑھتے تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اس طرح کے عناصر در آنا کوئی تعجب خیز بات نہیں معلوم ہوتی۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ احتشام حسین نے وضاحت وصراحت کے ساتھ تنقید کے اصول ونظریات پیش کیے ہیں اور پھر ان اصول ونظریات کو بہ حسن وخوبی اپنے تنقیدی مضامین میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نظریاتی اور عملی تنقید میں جتنی ہم آہنگی ومطابقت ان کے یہاں نظر آتی ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند ناقد کے یہاں پائی جاتی ہو۔

11.3.3 ماحصل

عزیز طلبا وطالبات! اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ احتشام حسین کے حالات زندگی، تنقیدی کارنامے اور ان کے تنقیدی نظریات سے بخوبی واقف ہو گئے ہوں گے۔ اس اکائی کا خلاصہ یہ ہے کہ احتشام حسین کا شمار اہم ترقی پسند ناقدین میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تنقید کا مرکز ومحور فلسفۂ حیات ہے۔ وہ اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ادب کا بنیادی کام زندگی کے مسائل کو پیش کرنا اور معاشرے کو بہتر بنانا ہے۔ یہ ان کا امتیاز ہے کہ وہ دیگر ترقی پسند ناقدین سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین میں مارکسی اصولوں کی پاس داری کے ساتھ صالح اقدار اور ادبی روایت پر زور ملتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے مارکسی اصولوں ونظریات کی پیش کش میں ترقی پسندوں کی کھوکھلی نعرے بازی، گھن گرج اور شدت پسندی سے اجتناب

کرتے ہوئے اپنی تنقیدی تحریروں میں اعتدال وتوازن برتا ہے۔انھوں نے نظریاتی تنقید میں شعروادب کو سمجھنے اوراس کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔وہیں دوسری طرف ان کے یہاں عملی تنقید کے عمدہ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔مخصوص مکتب فکر کے باعث ان کی عملی تنقید میں بھی افادی اور مقصدی پہلو غالب ہیں۔لہٰذا عملی تنقید میں انفرادیت کے بجائے اجتماعیت،سماجی وتہذیبی پس منظراور تاریخ وعمرانیات جیسے پہلوؤں کی اہمیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/ طالبات!اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- سید احتشام حسین کے سوانحی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کی۔
- سید احتشام حسین کے ادبی کارموں سے واقفیت حاصل کی۔
- سید احتشام حسین کے تنقیدی خیالات سے آگاہی حاصل کی۔
- سید احتشام حسین کی تنقید نگاری کی خصوصیات اور امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔
- تنقیدی میدان میں سید احتشام حسین کے مقام ومرتبے کو سمجھنے کی کوشش کی۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ سید احتشام حسین کے تنقیدی مجموعوں کے نام اوران کی سن اشاعت تحریر کیجیے۔

۲۔ مارکسی تنقید سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ واضح کیجیے۔

۳۔ سید احتشام حسین کے نظریۂ ادب کو مختصراً بیان کیجیے۔

۴۔ سید احتشام حسین کی عملی تنقید سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۵۔ سید احتشام حسین نے غالبؔ کو روایت شکن شاعر کیوں قرار دیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

11.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ سید احتشام حسین کا پہلا تنقیدی مجموعہ ''تنقیدی جائزے'' ہے۔یہ پہلی بار ۱۹۴۴ء میں ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد سے شائع ہوا۔''روایت اور بغاوت'' احتشام حسین کا دوسرا تنقیدی مجموعہ ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں ادارہ اشاعت اردو سے اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں سرفراز پریس،لکھنؤ سے شائع ہوا۔''ادب اور سماج'' تیسرا تنقیدی مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔

''تنقید اور عملی تنقید'' تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ ''ذوقِ ادب اور شعور'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ ''افکار و مسائل'' ۱۹۶۳ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ''عکس اور آئینے'' ایک اہم تنقیدی مجموعہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ''اعتبارِ نظر'' ان کے تنقیدی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''جدید ادب منظر پس منظر'' اتر پردیش اردو اکادمی سے ۱۹۷۸ء میں احتشام حسین کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جعفر عسکری نے شائع کروایا۔

۲۔ مارکسی تنقید میں انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر زور دیا جاتا ہے۔ معاشرتی، معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ اسلوب سے زیادہ مواد سے بحث کی جاتی ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک اچھا ادب وہی ہوگا جو زندگی کی ترجمانی کرتا ہو اور انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ ہو۔ دراصل مارکسی تنقید کا سارا دارومدار داخلیت کے بجائے مادیت پر قائم ہے۔

۳۔ سید احتشام حسین ایسے ادب کے قائل ہیں جو سماجی زندگی کے اظہار پر مبنی ہو اور محض لطف و انبساط کا وسیلہ نہ ہو۔ وہ سماجی سروکار کے بغیر پورے تنقیدی نظام پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ نظریاتی اعتبار سے سماجی و معاشرتی نقاد ہیں۔ جو ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ وہ جذبات و احساسات کے ساتھ اسلوب اور ہیئت کی تبدیلیوں کو بھی سماجی و معاشرتی زندگی کی تبدیلیوں کا نام دیتے ہیں۔

۴۔ عملی تنقید کے حوالے سے ترقی پسند نقادوں میں سب سے معتبر نام احتشام حسین کا ہے۔ ان کی عملی تنقید کی اہمیت کا اندازہ ان کے مختلف مضامین سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں انہوں نے قدیم و جدید ادب کا تجزیہ کر کے ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے پانچ درجن سے زیادہ مضامین میں عملی تنقید کی کارفرمائی ملتی ہے۔ غالب کی بت شکنی، اردو تنقید حالی اور ان کا عہد، اقبال بہ حیثیت شاعر و فلسفی، جگر کی شاعری، فیض کی انفرادیت، غزل میں محبوب کا بدلتا کردار اور نئی شاعری کا پس منظر، شعر فہمی وغیرہ عملی تنقید کے بہترین نمونے ہیں۔ ابتدائی دور کی تحریروں میں احتشام حسین کا جھکاؤ نظریاتی تنقید کی طرف نظر آتا ہے مگر جیسے جیسے ان کے اسالیب بیان میں پختگی پیدا ہوتی گئی عملی تنقید کی طرف بھی ان کا رجحان بڑھتا گیا۔

۵۔ سید احتشام حسین 'غالب کی بت شکنی' میں اپنے مخصوص نظریات کے برخلاف غالب کے اشعار کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان اشعار کے حوالے سے غالب کو روایت شکن شاعر قرار دیتے ہیں، جن کو اس سے

پہلے کے نقادوں نے عارفانہ موضوعات اور وحدت الوجود کے اشعار قرار دیا ہے۔انھوں نے اپنے تجزیے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب ایک روایت پسند زمانے میں اپنی جدت طبع سے ان بنے بنائے سانچوں کو منہدم کرتے ہیں جن سے باہر نکلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔غالب کا یہی انداز انہیں ایک روایت شکن شاعر بناتا ہے۔

11.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
نظریاتی تنقید	:	شعروادب سے متعلق اصول وضوابط وضع کرنا
عملی تنقید	:	معینہ اصولوں وضوابط کی روشنی میں شعروادب کا جائزہ لینا
مارکسی تنقید	:	کارل مارکس کے اشتراکی نظریات پر مشتمل تنقید
اختصار	:	مختصر،کم الفاظ میں اپنی بات کہنا
نگارشات	:	تحریریں،ادبی تخلیقات
توسیع	:	وسیع،کشادگی
مربوط	:	ربط وتسلسل ہونا
میلانات	:	رجحانات
ہم آہنگی	:	مطابقت، موانست
انحراف	:	مخالفت،انکار
قابل اعتنا	:	توجہ کے لائق،اہم،معتبر
جمالیات	:	حسن شناسی،ایسا علم جس میں حسن کے اصول واقدار سے بحث کی جائے
وثوق	:	اعتماد،بھروسہ،استحکام
ژرف بینی	:	بالغ نظری،باریک بینی

11.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ تنقید اور عملی تنقید : احتشام حسین

۲۔ اردو ادب کے تین نقاد : سید نواب کریم

۳۔ احتشام حسین ایک مطالعہ : اخلاق اثر

۴۔ سید احتشام حسین کچھ یادیں، کچھ جائزے : نذیر احمد

۵۔ احتشام حسین: حیات و شخصیت اور کارنامے: فدا مصطفیٰ فدوی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی12 شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری

12.3.1 شمس الرحمٰن فاروقی: حیات وخدمات

12.3.2 شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری

12.3.3 ماحصل

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

12.6 سوالوں کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی میں آپ:

- شمس الرحمٰن فاروقی کے سوانحی حالات وواقعات سے واقف ہوں گے۔
- شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی خدمات سے آگاہ ہوں گے۔
- شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی افکار ونظریات سے متعارف ہوں گے۔
- شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری سے روشناس ہوں گے۔
- اردو تنقید کی تاریخ میں شمس الرحمٰن فاروقی کی قدر و قیمت سے واقف ہوں گے۔

12.2 تمہید

عزیز طلبا/ طالبات! گذشتہ اکائی میں آپ نے سید احتشام حسین کی حیات وخدمات اور ان کی تنقید نگاری سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں شمس الرحمٰن فاروقی کی حیات وخدمات اور ان کی تنقید نگاری سے بہرہ یاب ہوں گے۔ فاروقی کی تنقید کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، نظم، افسانہ، ناول اور داستان وغیرہ پر بھرپور اور مدلل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تنقید کو پڑھنے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ فن پارے کی صالح اور صحت مند تنقید کس طرح اور کس انداز سے کی جاتی ہے۔

12.3 شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری

12.3.1 شمس الرحمٰن فاروقی: حیات وخدمات

شمس الرحمٰن فاروقی کی پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پرتاپ گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد خلیل الرحمٰن فاروقی تھا۔ مولوی محمد خلیل الرحمٰن فاروقی نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''قصص الجمیل فی سوانح الخلیل'' میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارا نسب نامہ حضرت شیخ عبداللہ ابن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔'' یہی وجہ تھی کہ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے نسب پر فخر کیا کرتے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی نجم الرحمٰن فاروقی سے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہی ایک چیز ہے جس پر ہم لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں ورنہ اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' فاروقی کو مطالعے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ان کی مطالعے سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جب وہ والدین کے ساتھ اعظم گڑھ میں تھے، تو وہاں ایک جلد ساز کی دکان جو بالکل ان کے مکان کے نیچے تھی، کے یہاں جا کر مختلف علوم وفنون پر جلد سازی کے لیے آئی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس مطالعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت کم عمری میں ہی انھیں دیگر علوم وفنون کے ساتھ فارسی اور اردو کے سیکڑوں اشعار ازبر ہو گئے۔ اعظم گڑھ میں قیام کے دوران انھوں نے ویسلی ہائی اسکول میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول گورکھپور سے ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء میں میاں جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور سے انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۳ء میں مہارانا پرتاپ کالج گورکھپور سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں شمس الرحمٰن فاروقی نے الٰہ آباد میں سکونت اختیار کی اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ستیش چندر ڈگری کالج بلیا میں ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۸ء تک بحیثیت انگریزی لکچرر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس (الائیڈ) میں کامیابی حاصل کی اور انڈین پوسٹل سروس میں ملازمت اختیار کر لی، جہاں وہ ایک طویل مدت تک اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن خوبی نبھاتے رہے۔ بالآخر ۱۹۹۴ء میں انڈین پوسٹل سروس کے ممبر کی حیثیت سے وہ اس نوکری سے سبکدوش ہوئے۔ اس دوران انھوں نے انگلستان، امریکا، پاکستان، تھائی لینڈ، سوویت یونین، سعودی عرب، سنگاپور، بنکاک اور کناڈا وغیرہ ممالک کے کئی پروگراموں میں بحیثیت مقرر اور مہمان شریک ہوئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو اردو سے بے پناہ محبت تھی۔ انگریزی کے لکچرر اور انڈین پوسٹل سروس میں ملازمت کرنے کے باوجود انھوں نے اردو زبان میں متعدد کتابیں تحریر کیں۔ ان کے علم کا دائرہ نہایت وسیع تھا، اس لیے انھوں نے ادب میں کسی ایک پیرائے کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ مثال کے طور پر انھوں نے تنقید، تحقیق، شاعری، افسانہ، ناول اور ترجمے جیسے میدانوں میں کامیاب طبع آزمائی کی۔ ان کی تنقیدی وتحقیقی کتابوں میں ''لفظ ومعنی''،

''اردو کا ابتدائی زمانہ''، ''عروض آہنگ اور بیان''، ''شعر غیر شعر اور نثر''، ''تنقیدی افکار''، ''اثبات ونفی''، ''غالب پر چار تحریریں''، ''اردو غزل کے اہم موڑ''، ''تعبیر کی شرح''، ''بوطیقا''، ''شعر شور انگیز''، ''افسانے کی حمایت میں''، ''تفہیم غالب'' اور ''ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' وغیرہ نہایت اہم ہیں۔ ''لغات روزمرہ'' کے نام سے انھوں نے ایک لغت بھی تحریر کی ہے۔ اس میں صحیح املا، درست الفاظ اور اس کی ادائیگی پر خاصا زور صرف کیا گیا ہے۔ شاعری میں ان کے چار مجموعے ''گنج سوختہ''، ''سبز اندر سبز''، ''چار سمت کا دریا'' اور ''آسماں محراب'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کی تمام شاعری کلیات کی شکل میں ''مجلس آفاق میں پروانہ ساں'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ''سوار اور دوسرے افسانے'' کے عنوان سے افسانوں کا ایک مجموعہ اور ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کے نام سے ایک ضخیم ناول شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی کتاب ''شعر شور انگیز'' کو جس میں میر تقی میرؔ کے منتخب اشعار کی تفہیم بالکل نئے اور اچھوتے انداز میں کی گئی ہے، پر حکومت ہند نے ۱۹۹۶ء میں سرسوتی سمان سے نوازا۔ اس کے بعد وہ ۲۰۰۹ء میں حکومت ہند کی جانب سے پدم شری کے اعزاز سے نوازے گئے۔ ان کی اردو خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے بھی انھیں ''ستارۂ امتیاز'' سے سرفراز کیا۔ ملک کی مختلف ریاستوں کی اکادمیوں کی جانب سے بھی انھیں اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ جن اکادمیوں نے انھیں اعزازات وانعامات سے نوازا ان میں یوپی اردو اکیڈمی، آل انڈیا میر اکیڈمی، آل انڈیا کریمیہ سوسائٹی، جمشید پور، دلی اردو اکادمی، ساہتیہ اکیڈمی اور فخر الدین علی احمد اکیڈمی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مختلف یونیورسٹیوں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ ان یونیورسٹیوں میں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، برٹش کولمبیا یونیورسٹی وین کوور کناڈا، وسکانسن یونیورسٹی میڈلین، پنسلوانیا یونیورسٹی فلاڈیلفیا اور شکاگو یونیورسٹی وغیرہ شامل ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک بڑا کارنامہ رسالہ ''شب خون'' کا اجرا ہے۔ یہ رسالہ سنہ ۱۹۶۶ء میں الٰہ آباد سے نکلنا شروع ہوا۔ اس رسالے کے بانی اور مرتب شمس الرحمٰن فاروقی ہی تھے۔ ''شب خون'' کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے جدید ادبی نظریات وتصورات کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تخلیق کاروں اور نقادوں کو بندھے ٹکے اصول کے تحت ادب تخلیق کرنے یا تنقید کرنے کے بجائے ایسی قدروں کی طرف انھیں راغب کرنے کی کوشش کی جس کا تعلق براہ راست ادب سے ہو۔ یہ رسالہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ چالیس برس تک اردو ادب کی خدمت کرنے کے بعد بالآخر ۲۰۰۵ء میں بعض مجبوریوں کے تحت اسے بند کر دیا گیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ از اول تا آخر ایک طالب علم بھی تھے اور معلم بھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقات اور نظریات کے ذریعے اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشنے میں اہم کردار

ادا کیا۔ عام طور پر عمر کے ساتھ یاداشت کمزور ہوتی جاتی ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کی یادداشت زندگی کے آخری ایام تک مضبوط رہی۔ سال ۲۰۲۰ء میں کرونا جیسے مہلک مرض میں گرفتار ہوکر فاروقی بھی ادبی دنیا کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان کا انتقال ۲۵ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو الٰہ آباد میں ہوا اور یہیں دفن کیے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں مہر افشاں فاروقی اور باراں فاروقی بقید حیات ہیں۔ مہر افشاں فاروقی ان دنوں ورجینیا یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور باراں فاروقی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر تھیں، قبل از وقت مستعفی ہوکر الٰہ آباد میں مقیم ہیں۔

12.3.2 شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری

شمس الرحمٰن فاروقی کی پہلی کتاب ''لفظ و معنی'' (۱۹۶۸ء) ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کے بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے ذریعے فاروقی پہلی بار بحیثیت نقاد ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ انھوں نے سب سے پہلے ادب میں پھیلے ان خیالات و نظریات پر کاری ضرب لگائی جسے بالخصوص ترقی پسندوں نے ہوا دے رکھی تھی۔ انھوں نے اپنی تنقید کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ادب نہ تو محض زندگی کا آئینہ دار ہے اور نہ ہی محض تفریح کا ذریعہ۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

> ''ادب کا موضوع کل زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک ننھا سا ٹکڑا ہے جس کو ادیب اپنی شخصیت کی رنگا رنگی، مزاج کی بلندی اور تخیل کی تیزی سے ایک نئی زندگی اور ایک نیا حسن بخش دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی، خیالی ہو یا واقعی، بس اسے زندہ اور متحرک ہونا چاہیے۔ نہ زندگی کا ہر پہلو ادب ہوتا ہے اور نہ ادب کا ہر پہلو زندگی۔ شہد کی مکھیوں کے عادات و خواص اور ان کی حرکتیں زندگی کا ایک جز ہیں لیکن وہ ادب کا موضوع نہیں بن سکتیں جب تک کہ ادیب ان کو اپنے تخیل کے زور سے ایک تمثیلی کیفیت نہ بخش دے۔''
>
> (لفظ و معنی، شمس الرحمٰن فاروقی، ۱۹۶۸ء، ص:۱۱)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اسی طرح نثر اور نظم سے متعلق اپنے خیالات کا دوٹوک اظہار کیا۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ نثر اور نظم دونوں بنیادی طور پر ایک ہی چیز ہے۔ کولرج نے کہا تھا کہ بسا اوقات نثر نظم بن سکتی ہے۔ لیکن فاروقی اس بیان سے پوری طرح متفق نہیں دکھائی دیتے۔ وہ نثر اور نظم دونوں کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں رکھنے کے قائل ہیں۔ ان کے مطابق نظم میں وزن کا باقاعدہ ڈھانچہ اور آہنگ کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر نظم گائی جاسکے، لیکن یہ ضروری ہے کہ با آواز بلند پڑھی جاسکے۔ اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب ''شعر غیر شعر اور نثر'' میں مفصل گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں ''شعر غیر شعر اور نثر'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون بھی شامل ہے۔ مضمون کے آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے انھوں نے شعر اور نثر کی

امتیازی خصوصیات درج کردیں ہیں۔شاعری کے لیے وہ موزونیت، اجمال، جدلیاتی الفاظ (تشبیہ، استعارہ، علامت، پیکر) اور ابہام کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ان کے مطابق غیر شعر وہ ہے جس میں موزونیت اور اجمال کے علاوہ برجستگی، سلاست، طنز ومزاح، بے تکلفی وغیرہ میں سے کوئی خوبی موجود ہو۔نثر کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ توضیحی یا تخلیقی ہونے کے ساتھ موزونیت اور اجمال سے عاری ہوتی ہے۔

الطاف حسین حالی کے بعد فاروقی ہی وہ نقاد ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ شعر کی تعریف بالکل نئے اور اچھوتے انداز میں کرنے کے ساتھ شعر کی ماہیت پر نہایت تفصیل سے نظریاتی بحث کی ہے۔نظریاتی تنقید ان تصورات اور اصولوں سے بحث کرتی ہے جس کی روشنی میں ہم کسی بھی ادب پارے کا تعین یا اس کی شناخت فن پارے کے طور پر کرتے ہیں۔نظریاتی تنقید چوں کہ تمام طرح کی تنقیدی کارگزاریوں کی بنیاد ہے اس لیے فاروقی نے نظریاتی تنقید پر سب سے زیادہ توجہ صرف کی ہے۔وہ نظریاتی تنقید کو کس حد تک ضروری سمجھتے تھے اس کا اندازہ ان کی کتاب ''تنقیدی افکار'' میں شامل مضمون ''کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے؟'' سے لگایا جاسکتا ہے۔موجودہ دور کے تنقیدی رویوں سے فاروقی نہایت نالاں دکھائی دیتے تھے کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ ''آج اردو تنقید میں مسائل کا فقدان اس لیے نہیں ہے کہ سارے سوالات پر بحث ہوچکی ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ سوالات اٹھائے ہی نہیں گئے۔'' لہٰذا انھوں نے شعر وادب اور تنقید کی مبادیات سے منسلک مسائل پر اپنے مخصوص انداز نقد سے جس قدر سوالات اٹھا کر اس کے جوابات مہیا کیے ہیں وہ ادبی مسائل کے تدارک اور شکوک وشبہات دور کرنے کا عدیم النظیر وسیلہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی شاعری بالخصوص کلاسیکی اور اس میں بھی غزلیہ شاعری کے گرویدہ تھے۔ان کے تنقیدی سرمائے کا ایک بڑا حصہ شاعری کی تنقید پر مبنی ہے۔انھوں نے جدید اور کلاسیکی شعرا پر خاصا زور صرف کیا ہے۔ مثلاً: میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؔ اور اکبرالہ آبادی وغیرہ۔میرؔ اور غالبؔ ان کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ لیکن بہ نسبت غالبؔ کے میرؔ کو وہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی کتاب ''تفہیم غالب'' میں غالب کے منتخب اشعار کا تجزیہ جس انداز سے کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔اس کتاب میں انھوں نے غالبؔ کے اشعار کی تعریف بھی کی ہے اور کہیں کجی یا خامی نظر آئی تو دلیل کے ساتھ اس کا اظہار بھی کیا ہے۔مختصر یہ کہ غالبؔ کے کلام پر ان کے تجزیے کو عملی تنقید کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

فاروقی کو کلاسیکی شعرا میں میر تقی میرؔ سب سے زیادہ پسند تھے۔لہٰذا اسی دلچسپی نے انھیں میر کے کلام کی شرح لکھنے پر مجبور کیا اور چار جلدوں پر مشتمل ''شعر شور انگیز'' جیسی مایہ ناز کتاب منظر عام پر آئی۔''شعر شور انگیز'' دیگر شرحوں سے بالکل مختلف ہے۔اس کتاب میں اول انھوں نے میر کے تمام کلام کے بجائے منتخب اشعار کی تشریح کی ہے۔دوئم یہ کہ اس کتاب میں فقط میر کے کلام کی تشریح ہی نہیں، بلکہ غیر جانب دارانہ اور غیر روایتی طور سے استدلال نقد شعر بھی ہے۔سوم دوران توضیح دیگر شعرا کے کلام سے تقابل اور شعر کا تعین قدر وغیرہ شعر شور انگیز کو منفرد بناتی ہے۔

فاروقی غزل کی طرح داستان سے بھی بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ذاتی لائبریری میں داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدیں آج بھی موجود ہیں۔ان میں سے ہر جلد تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔اس قدر ضخیم داستان کو فاروقی نے نہ صرف یکجا کیا بلکہ پانچ جلدوں پر مشتمل ''ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' کے عنوان سے کتاب بھی تیار کی۔اس کتاب میں انھوں نے داستان امیر حمزہ کا تنقیدی مطالعہ پیش کرنے سے قبل ان اصولوں یا شعریات کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جو ہند اسلامی معاشرے کی دین ہے۔انھوں نے تفصیل کے ساتھ اس نکتے پر بھی بحث کی ہے کہ ناول یا افسانے کے پلاٹ اور کردار کی خوبی یا خامی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے داستانوں کے کردار یا پلاٹ کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ جس طرح ناول کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تعلق حقیقی زندگی سے ہو، اسی طرح داستان کے لیے لازم ہے کہ اس کا تعلق خیالی دنیا سے ہو۔داستان چوں کہ زبانی بیانیے کا فن ہے لہٰذا یہ ایک شخص سے دوسرے شخص کے پاس منتقل ہوتی رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے متن میں ہمیشہ حذف و اضافے کا سلسلہ (جب تک کہ وہ تحریری صورت میں شائع نہ ہوجائے) جاری رہتا ہے۔ان ہی ساری باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے فاروقی نے کہا تھا کہ داستان کا کوئی مصنف نہیں ہوتا۔مختصر یہ کہ پانچ جلدوں پر مشتمل ان کی یہ کتاب داستان کی شعریات، ہندوستانی معاشرہ، اسلامی تہذیب اور داستان امیر حمزہ جیسی طویل داستان کو سمجھنے کے لیے نہایت معاون و مددگار ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔انھوں نے شاعری اور نثر سے متعلق اہم تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں۔فن پارے سے متعلق ان کے بیان کردہ دلائل، قطعیت، توضیح اور انداز بیان اس قدر موثر ہیں کہ ان کے موافقین اور مخالفین سبھی ان کی تنقید کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔مشرقی و مغربی علوم سے واقفیت اور استدلالی انداز بیان کو دیکھتے ہوئے محمد حسن عسکری نے شمس الرحمٰن فاروقی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''لوگ اب آپ کا نام حالی کے ساتھ لینے لگے ہیں۔'' حسن عسکری کا یہ کہنا دراصل اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ حالی نے پہلی بار شاعری کو پرکھنے کے لیے تنقید کے جو اصول و ضوابط مرتب کیے اور اس کے عملی نمونے پیش کیے تھے، اس کی توسیع کا فریضہ فاروقی انجام دے رہے ہیں۔یعنی حالی نے جس پودے کی تخم ریزی کی تھی فاروقی نے اسے ایک تناور درخت کی صورت عطا کردی۔یہ حقیقت ہے حالی کے بعد جس سنجیدگی اور امعان نظری سے فاروقی نے شعر و ادب کے مختلف اصناف کی شعریات مرتب کر کے متن فہمی، تعین قدر اور بالخصوص کلاسیکیت کی بازیافت کی ہے وہ انھیں کا طرۂ امتیاز ہے۔

12.3.3 ماحصل

عزیز طلبا/ طالبات! مذکورہ گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت علمی، ادبی اور آفاقی حیثیت کی حامل ہے۔انھیں زمانۂ طفلی سے ہی مطالعے کا شوق تھا اور اسی مطالعے نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا جہاں تک رسائی ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔انھوں نے تنقید و تحقیق کے ساتھ تخلیقی دنیا میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے

ہیں۔ شاعری میں ان کے چار مجموعے ''گنج سوختہ''، ''سبز اندر سبز''، ''چار سمت کا دریا'' اور ''آسماں محراب'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' اور ایک ضخیم ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ترجمہ نگاری اور لغت نویسی (لغات روزمرہ) جیسے مشکل فن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تنقید کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ فن پارے کا تجزیہ و تنقید، اس کی تشریح یا اس کے نتائج کو مبسوط اصولوں کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ مشرقی فن پارے کو مغربی اصولوں کے تحت پرکھنے کی جو فضا ہموار تھی اس بت کو توڑنے میں بھی انھوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی تنقید کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تحقیق کا عنصر بھی اکثر و بیشتر شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں ''شعر غیر شعر اور نثر''، ''شعر شور انگیز''، ''ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ''، ''تنقیدی افکار''، ''اثبات و نفی'' اور ''تفہیم غالب'' جیسی کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- شمس الرحمٰن فاروقی کے سوانحی حالات و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- شمس الرحمٰن فاروقی کے ادبی کارناموں سے آگہی حاصل کی۔
- شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی خیالات سے واقفیت حاصل کی۔
- شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری کے امتیازی پہلوؤں کی معلومات حاصل کی۔
- تنقید کے میدان میں شمس الرحمٰن فاروقی کے مقام و مرتبے کی جانکاری حاصل کی۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی مختصر حالات زندگی قلم بند کیجیے۔

۲۔ رسالہ ''شب خون'' سے متعلق اپنی معلومات سپرد قلم کیجیے۔

۳۔ ''شعر شور انگیز'' سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۴۔ ''داستان امیر حمزہ'' کے تعلق سے فاروقی کی کارکردگی پر روشنی ڈالیے۔

۵۔ فاروقی کے نظریۂ نثر و نظم پر اظہار خیال کیجیے۔

12.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پرتاپ گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد خلیل الرحمٰن فاروقی تھا۔ انھیں بچپن سے مطالعے کا شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہایت کم عمری میں ہی انھیں دیگر علوم و فنون کے ساتھ فارسی اور اردو کے سیکڑوں اشعار یاد ہو گئے تھے۔ انھوں نے ویسلی ہائی اسکول،

اعظم گڑھ سے ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول گورکھپور سے ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول، ۱۹۵۱ء میں میاں جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور سے انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۳ء میں مہاراناپرتاپ کالج گورکھپور سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ستیش چندر ڈگری کالج بلیا اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ میں کچھ مدت بحیثیت انگریزی لکچرر درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس (الائیڈ) میں کامیابی حاصل کی اور انڈین پوسٹل سروس میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس ملازمت کے دوران بھی انھوں نے اردو زبان میں متعدد کتابیں تحریر کیں، جس سے ان کی اردو زبان وادب سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''شعرشورانگیز'' پر حکومت ہند نے انھیں ۱۹۹۶ء میں سرسوتی سمان سے نوازا۔ ۲۰۰۹ء میں وہ پدم شری کے اعزاز سے نوازے گئے۔ ان کی اردو خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے بھی انھیں ''ستارۂ امتیاز'' سے سرفراز کیا۔ علاوہ ازیں ملک کی مختلف ریاستوں کی اکادمیوں کی جانب سے بھی انھیں اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال ۲۵؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو الٰہ آباد میں ہوا اور یہیں دفن کیے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک بڑا کارنامہ رسالہ ''شب خون'' کا اجرا ہے۔ یہ رسالہ سنہ ۱۹۶۶ء میں الٰہ آباد سے نکلنا شروع ہوا۔ اس رسالے کے بانی اور مرتب شمس الرحمٰن فاروقی ہی تھے۔ ''شب خون'' کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے جدید ادبی نظریات وتصورات کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تخلیق کاروں اور نقادوں کو بندھے ٹکے اصول کے تحت ادب تخلیق کرنے یا تنقید کرنے کے بجائے ایسی قدروں کی طرف انھیں راغب کرنے کی کوشش کی جس کا تعلق براہ راست ادب سے ہو۔ یہ رسالہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ چالیس برس تک اردو ادب کی خدمت کرنے کے بعد بالآخر ۲۰۰۵ء میں بعض مجبوریوں کے تحت اسے بند کردیا گیا۔

۳۔ ''شعرشورانگیز'' ایسی کتاب ہے جس پر اردو والے بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل کلیات میرؔ کی شرح ہے، لیکن فاروقی نے تمام کلام کے بجائے کتاب میں منتخب اشعار کی تشریح کو ترجیح دی ہے۔ تشریح کے دوران انھوں نے دیگر شارحین کے رویوں سے انحراف کرتے ہوئے اچھوتے انداز میں اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کیا ہے۔ تشریح کے دوران انھوں نے یکساں خیالات کے حامل دوسرے شعرا کے اشعار کو نقل کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیگر اشعار کے مقابلے میں میر کا شعر کس درجہ برتر یا کمتر ہے۔ صنائع بدائع کا استعمال اشعار میں کہاں اور کس طرح ہوا ہے اور اس کے استعمال نے شعر کو کس درجہ متاثر کیا ہے۔ ان تمام باتوں کو فاروقی نے تشریح کے دوران ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی اس محنت شاقہ کے عوض حکومت ہند نے ۱۹۹۶ء میں انھیں اس کتاب پر سرسوتی سمان سے نوازا۔

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدوں کو یکجا کرنے، ان کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کرنے اور داستان کی شعریات متعین کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا، رہتی دنیا تک اسے نظرانداز

نہیں کیا جاسکتا ہے۔ داستان سے متعلق پانچ جلدوں پر مشتمل ان کی کتاب ''ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' مذکورہ بات پر دال ہے۔ فرد، معاشرہ اور کائنات جو داستان کی اصل ہے، کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ داستان سے ہم ناول یا افسانے میں موجود حقیقی زندگی کی امید نہیں کر سکتے۔ یہ زبانی بیانیے کا فن ہے اور یہاں وہ تمام باتیں ممکن ہیں جو خیالی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ناول کے آنے کے بعد داستان زوال پذیر ہوگئی۔ فاروقی نے اس بات کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ داستان کے زوال کی اصل وجہ ان امرا اور رؤسا کا معدوم ہونا ہے جو داستان گویوں کی پرورش کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جب وہ نہیں رہے تو داستان گویوں نے معاش کے دوسرے ذرائع تلاش کر لیے اور اس طرح داستان زوال پذیر ہوگئی۔ مختصر یہ کہ فاروقی کی یہ کتاب داستان کی تہذیب اور شعریات کو سمجھنے میں نہایت مفید اور اہم ہے۔

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے نثر اور نظم سے متعلق اپنے خیالات کا دوٹوک اظہار کیا ہے۔ ان کے مطابق نظم میں وزن کا باقاعدہ ڈھانچہ اور آہنگ کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر نظم گائی جاسکے، لیکن یہ ضروری ہے کہ با آواز بلند پڑھی جاسکے۔ اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب ''شعر غیر شعر اور نثر'' میں مفصل گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں ''شعر غیر شعر اور نثر'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون بھی شامل ہے۔ مضمون کے آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے انھوں نے شعر اور نثر کی امتیازی خصوصیات درج کر دیں ہیں۔ شاعری کے لیے وہ موزونیت، اجمال، جدلیاتی الفاظ (تشبیہ، استعارہ، علامت، پیکر) اور ابہام کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے مطابق غیر شعر وہ ہے جس میں موزونیت اور اجمال کے علاوہ برجستگی، سلاست، طنز و مزاح، بے تکلفی وغیرہ میں سے کوئی خوبی موجود ہو۔ نثر کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ توضیحی یا تخلیقی ہونے کے ساتھ موزونیت اور اجمال سے عاری ہوتی ہے۔

12.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
نسب	:	خاندانی سلسلہ (باپ کی طرف سے)
جلدساز	:	کتاب وغیرہ کی جلد بنانے والا
سبکدوش	:	ذمہ داری سے فارغ، ریٹائر
ضخیم	:	موٹا
نکتہ	:	پہلو
مہلک مرض	:	خطرناک بیماری
مستعفی	:	استعفیٰ دینے والا
تخم ریزی	:	بیج بونا

آہنگ	:	آواز
داغ مفارقت	:	جدائی کا غم
عوامل	:	اسباب
شعریات	:	اصول
معدوم	:	غائب، ختم ہونا
لازمی	:	ضروری
بقیدحیات	:	زندہ
دال	:	دلیل، حجت
عدیم النظیر	:	بے مثال
طرۂ امتیاز	:	امتیاز کا سبب
امعان نظری	:	گہری نظر، غیر معمولی نظر
زمانۂ طفلی	:	بچپن کے زمانے میں
ضرب	:	چوٹ
خواص	:	تاثیر
تدارک	:	بھرپائی

12.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی شخصیت اور ادبی خدمات (کتاب نما): احمد محفوظ

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری : محمد منصور عالم

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی نمبر، روشنائی، کراچی : احمد زین الدین/نکہت بریلوی

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی ادیب و دانشور : سید رضا حیدر/محضر رضا

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی نمبر : عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی

اکائی13 گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

ساخت

13.1 اغراض ومقاصد

13.2 تمہید

13.3 گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

13.3.1 گوپی چند نارنگ: حیات وخدمات

13.3.2 گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

13.3.3 ماحصل

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

13.6 سوالوں کے جوابات

13.7 فرہنگ

13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا/ طالبات اس اکائی میں آپ:

- گوپی چند نارنگ کے سوانحی حالات وکوائف سے متعارف ہوں گے۔
- گوپی چند نارنگ کی ادبی خدمات سے روشناس ہوں گے۔
- گوپی چند نارنگ کے تنقیدی تصورات سے واقف ہوں گے۔
- گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کے امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- تنقیدی میدان میں گوپی چند نارنگ کی قدر ومنزلت سے متعارف ہوں گے۔

13.2 تمہید

عزیز طلبا/ طالبات ! پچھلی اکائی میں آپ نے شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری کو پڑھا جس سے ان کی تنقید نگاری کے طریق کار، ان کے تنقیدی تشخص اور تصور نقد سے آگہی حاصل ہوئی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں اردو کے ایک اہم نقاد گوپی چند نارنگ کی حیات وخدمات اور ان کی تنقید نگاری کے بارے میں پڑھیں گے۔ نارنگ کا شمار بیسویں صدی کے نظریہ ساز ناقدین میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک ادبی مفکر، محقق اور لسانیاتی نقاد ہیں۔

مابعد جدیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کی خاص پہچان ہے۔شعر و ادب کا لسانیاتی مطالعہ ان کی تنقید کا امتیاز ہے۔وہ خصوصی طور سے فن پارے کے ثقافتی اور تہذیبی مطالعات، لسانیاتی اور اسلوبیاتی طریق کار، ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے نظریہ و عمل سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

13.3 گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

13.3.1 گوپی چند نارنگ: حیات و خدمات

ان کا اصل نام گوپی چند نارنگ اور تاریخِ پیدائش ۱۱ر فروری ۱۹۳۰ء ہے۔جب کہ سرکاری ریکارڈ میں یکم جنوری ۱۹۳۱ء درج ہے۔جائے پیدائش دکی ضلع لورلائی، بلوچستان ہے۔والد کا نام دھرم چند نارنگ اور والدہ کا ٹیکا بائی تھا۔انھوں نے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے جھجھر، ضلع روہتک میں سکونت پذیری اختیار کی۔نارنگ کی ابتدائی تعلیم فورٹ سنڈے من، ہرنائی، موسیٰ خیل میں ہوئی۔انھوں نے مڈل پشین، کوئٹہ سے، میٹرک، لیّہ، مظفر گڑھ سے ۱۹۴۶ء میں پاس کیا۔انٹرمیڈیٹ فورٹ سنڈے من کوئٹہ اور تقسیمِ ملک کے بعد دلی کالج اجمیری گیٹ سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔انھوں نے اعلیٰ تعلیم بی۔اے ۱۹۵۰ء، ایم۔اے (اردو) ۱۹۵۴ء اور پی۔ایچ۔ڈی ۱۹۵۸ء میں دہلی یونیورسٹی سے کیا۔مزید برآں وہ فارسی آنرز، پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۱ء میں سند یاب ہوئے۔مزید انھوں نے ۱۹۶۴ء میں دہلی یونیورسٹی سے لسانیات میں ڈپلوما کیا اور ۱۹۶۶ء سمعیات اور تشکیلی گرامر پر مبنی خصوصی کورس، انڈیانا یونیورسٹی امریکہ سے کیا۔

نارنگ نے اپنی ملازمت کا آغاز دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفنز کالج کی عارضی لکچررشپ سے ۱۹۵۷ء میں کیا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مستقل طور سے بحیثیت لکچرر تقرر ہو گیا۔اس کے بعد ترقیاتی زینے طے کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدرِ شعبہ اور پروفیسر ایمریٹس کے منصب پر فائز ہوئے۔انھوں نے اردو قومی کونسل کے نائب صدر، ساہتیہ اکادمی کے صدر اور امریکہ کی وسکانس، می ناسوٹا، میڈیسن جیسی یونیورسٹیوں کے وزٹنگ پروفیسر کے طور سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔جہاں نارنگ کو بہت سی سوسائٹیوں کی طرف سے اعلیٰ وظیفے ملے، وہیں ان کو بہت سے خطابات، اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔مثلاً: غالب اکادمی، اردو اکادمی (اتر پردیش اور بہار)، میر ایوارڈ، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، پدم بھوشن، ستارہ امتیاز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔نارنگ نے دنیا کے بیشتر ممالک کے سفر کیے تھے اس لیے انھیں ''سفیرِ اردو'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

نارنگ نے پہلی شادی تارا سے کی جن سے ایک بیٹا ارون نارنگ ہوئے جو ٹورنٹو کینیڈا میں ڈینٹل سرجن ہیں۔ تارا سے طلاق ہوئی تو منورما سے دوسری شادی کی، ان سے ترون نارنگ ہوئے جو نارتھ کیرولائنا امریکہ میں جی آئی کے ماہر ہیں۔

نارنگ کی پہلی تخلیق افسانے کی صورت میں ہفتہ اور بلوچستان سماچار میں ۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آئی اور پہلا مضمون ۱۹۵۳ء میں اکبرالہ آبادی پر ''نگار'' میں شائع ہوا۔ تحقیقی نوعیت کا مقالہ ''اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ'' ۱۹۵۲ء میں مشتہر ہوا۔ ''اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات'' نوائے ادب میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے ''معراج العاشقین'' کو ۱۹۵۷ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔ اسی طرح ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' ۱۹۶۰ء، ''اسلوبیاتِ میر'' ۱۹۸۵ء، ''سانحہ کربلا بطورِ شعری استعارہ: اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان'' ۱۹۸۶ء، ''امیر خسرو کا ہندوی کلام'' ۱۹۸۷ء، ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' ۱۹۸۹ء، ''قاری اساس تنقید: مظہریت اور قاری کی واپسی'' ۱۹۹۲ء، ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' ۱۹۹۳ء، ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'' ۲۰۰۲ء، ''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری'' ۲۰۰۳ء، ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت'' ۲۰۰۴ء، ''جدیدیت کے بعد'' اور ''فکشن شعریات: تشکیل و تنقید'' ۲۰۰۵ء، ''کاغذ آتش زدہ'' ۲۰۰۹ء، ''تپش نامہ تمنا'' ۲۰۱۱ء، ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' ۲۰۱۳ء ان کی اہم تصنیفات و تالیفات ہیں۔

13.3.2 گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

پیارے طلبا/ طالبات! گوپی چند نارنگ کی تنقید کی تین اہم جہتیں ہیں۔ سب سے پہلی جہت یہ ہے کہ انھوں نے ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے اسلوبیات، ساختیات اور پس ساختیاتی نظریات کو باہم مربوط کر کے دیکھا ہے۔ ان کی یہ سطح نظریاتی مباحث پر مبنی ہے۔ ان کی تنقید کا دوسرا پہلو تہذیب سے وابستہ ہے۔ یہ تہذیبی سروکار انھیں زبان کے سماجی اور تہذیبی کردار سے باہم کرتا ہے۔ ان کی تنقید کا تیسرا رخ اطلاقی ہے۔ انھوں نے لسانیاتی اور اسلوبیاتی تنقید سے اپنا رشتہ استوار رکھا، اس کے ساتھ ہی تنقید کے ہیئتی مکتبِ فکر سے بھی مدد لی اور اپنے کئی ایک مضامین میں استعارہ، علامت، تناؤ، قولِ محال اور تضاد جیسی فنی تدبیروں کو بروئے کار لا کر بعض ناقابل فراموش نکتوں کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے شعر و ادب کی تنقید میں بہتر سے بہتر اصولوں کی بازیافت کی ہے۔

نارنگ نے اپنی تنقید کا آغاز فن پارے کے لسانیاتی مطالعے سے کیا ہے۔ اس مطالعے کی چار بنیادی سطحیں ہیں: صوتیات (Phonology)، صرفیات (Morphology) معنیات (Semantics) اور نحویات (Syntax) پھر ان چاروں کی متعدد اقسام بیان کی گئی ہیں۔ ان کی ادبی، تفہیمی اور تنقیدی سرگرمیاں لسانیاتی مباحث سے شروع ہوئیں۔ پھر اسلوبیاتی، صوتیاتی اور ساختیاتی مراحل سے گزر کر مابعد ساختیاتی نظریات بالخصوص ردتشکیل اور قاری اساس تنقید کی تفہیم و تعریف اور اطلاق تک جا پہنچیں۔ لسانیاتی تنقید کوئی مکمل تنقیدی شعبہ نہیں بلکہ یہ ایک ادبی تنقید کا چھوٹا سا کا پیمانہ/ سانچہ ہے، جو جزوی طریقۂ نقد کا متحمل ہے۔

لسانیاتی مباحث کے بعد نارنگ نے اردو میں اسلوبیاتی تنقید کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اسلوبیات وضاحتی

لسانیات کی ایک شاخ ہے جو ادبی اظہار کی ماہیت، عوامل اور خصائل سے بحث کرتی ہے۔ اسلوبیات، اسلوب کے مسئلے پر تاثراتی نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ معروضیت وقطعیت سے فن پارے کا تجزیہ کر کے مدلل سائنسی صحت کے ساتھ نتائج پیش کرتی ہے۔ اسلوبیات کے ضمن میں ان کی کتاب ادبی تنقید اور اسلوبیات کلیدی درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے پہلے مضمون ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' میں اصول سازی کی ہے اور باقی مضامین عملی نمونوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً: ''اسلوبیاتِ میر، اسلوبیاتِ انیس، اسلوبیاتِ اقبال، فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام، عالی جی کے من کی آگ، شہریار: نئی شاعری اور اسمِ اعظم، بانی نئی غزل کا جوان مرگ شاعر، ساقی فاروقی: زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے؟، افتخار عارف: شہرِ مثال کا دردمند شاعر'' وغیرہ مضامین شاعری تنقید کے عمدہ اور مثالی نمونے ہیں۔ نارنگ اسلوبیاتی تنقید کی بنیادی کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اسلوبیاتی مطالعے کی سب سے بڑی کمزوری یہ قرار دی ہے کہ بسیط فن پاروں کے لیے اس کا استعمال بہت ہی مشکل ہے۔ یعنی غزل یا مختصر نظم کا تجزیہ آسان ہے اور ناول اور افسانے کا مشکل۔ نثر کے تجزیے میں یہ بھی دقت ہے کہ تصنیف کے کس حصے کو نمائندہ سمجھا جائے اور کس کو نظر انداز کیا جائے۔ وہ لسانیاتی تنقید کے بارے میں بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ بھی مکمل تنقید ہے اور نہ ہی ادبی تنقید کا بدل ہے۔

بہر کیف ان کی اسلوبیاتی تنقید کو سمجھنے کے لیے ''اسلوبیات میر'' کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس میں انھوں نے صوتی، نحوی اور لفظیاتی نظام کے تحت کلامِ میر کا تجزیہ کر کے اسلوبِ شعر کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی کی ہے۔ وہ میر کے منفرد لہجے کی شناخت کے لیے سودا اور میر کے ایک ایک مطلع کو زیر بحث لاتے ہیں۔ مثلاً: سوداؔ کے مطلع سے:

چمن میں صبح جو اوس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

میرؔ کے مطلع:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سودا کا مطلع معمولی نہیں۔ چمن، صبا، تیغ، آبِ رواں میں معنوی اور صوتی نسبتیں ہیں۔ نیز جنگجو کی رعایت سے صبا کا آب رواں سے تیغ کا کام لینا بھی خالی از لطف نہیں، لیکن میر کے مطلع میں دل کو چھو لینے والی جو کیفیت ہے، سودا کا مطلع اس سے خالی ہے۔ کیوں؟ شعر میں معنویت، تصویریت، کیفیت سب لفظوں کے ذریعے پیدا ہوتی ہے اور زبان کا تخلیقی استعمال ہی شاعر کی اپج، فطری جوہر، جوشِ جذبات اور زورِ تخیل کی

بنیادی کلید فراہم کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مطلع میں میر کی فطری افتاد نے ان کے لہجے کو کس طرح یک لخت سودا سے الگ کر دیا ہے۔ سودا کے شعر میں چمن، صبح، جنگجو، صبا، تیغ، آب، کام کیا ہیں؟ یہ سب اسم ہیں۔ پورا مصرع سات اسما کا مجموعہ ہے۔ اب میر کا مطلع دیکھیے۔ علاوہ لفظ نام کے جو دونوں شعروں میں مشترک ہے، سارے شعر میں صرف ایک اسم ہے، دلِ ستم زدہ، اور شعر کا پورا معنیاتی نظام اس ایک اسم کے گرد گھومتا ہے''

(ادبی تنقید اور اسلوبیات، گوپی چند نارنگ، ص:۳۲۔۳۱)

نارنگ کے مذکورہ تجزیے سے یہ اندازہ ہوا کہ کسی فن پارے کو پرکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسمیت وفعلیت کا تجزیہ کیا جائے اور انہیں خطوط پر عظمتِ شعر کا تعین کیا جائے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نارنگ نے اسلوبیات کے حوالے سے کلامِ میر کے مختلف گوشوں کا تفصیلی تجزیہ کر کے ایک نئے میر کی بازیافت کی ہے۔

اسی طرح انھوں نے انیس کے مرثیوں کا مفصل اسلوبیاتی مطالعہ کیا ہے۔ جس میں سب سے پہلے انیس کے کمالِ فن کی پہلی اور بنیادی خوبی، فصاحت سے بحث کی ہے۔ انھوں نے کلامِ انیس کے اسلوبیاتی مطالعے کے لیے بطور دلیل دو مشہور مرثیے ''نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری'' اور ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' سے چند بندوں کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان بندوں اور متعدد مصرعوں کا صوتیاتی تجزیہ دو سطحوں پر کیا ہے: اول مصوتوں اور مصمتوں کا تجزیہ۔ دوم مصرعوں کے افعال کا مطالعہ۔ نارنگ نے مصوتوں اور مصمتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اختصاراً فعل اور فعلِ امدادی کا جائزہ لے کر انیس کے اختصاصی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ مزید انھوں نے دبیر کے مراثی، حالی اور چکبست کی مسدس والی نظموں کا صوتی مطالعہ کر کے آزاد اور پابند بندوں کا اوسط نکال کر یہ ثابت کیا ہے کہ انیس کی یہ مذکورہ خوبی مسدس کے فارم کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہ ان کے فن کا مخصوص حصہ ہے۔

اسلوبیات کے حوالے سے نارنگ نے اقبال پر دو مضمون تحریر کیے ہیں۔ پہلے مضمون میں اقبال کی شاعری کا صوتیاتی مطالعہ کیا ہے۔ جس سے اقبال فہمی کا ایک نیا تناظر پیدا ہوا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کے صوتیاتی نظام کے تجزیے کے لیے تین شاہکار نظموں (مسجدِ قرطبہ، ذوق وشوق، خضر راہ) کا انتخاب کیا گیا ہے اور پھر تینوں نظموں کا الگ الگ جائزہ لے کر ریاضی مشق سے ''صفیری و مسلسل آوازوں'' اور ''ہکار و معکوس آوازوں'' کا شماراتی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ ان آوازوں میں امتیاز پیدا کر کے معنیاتی ہم آہنگی کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ دوسرے مضمون میں صرفی اور نحوی نظام کو نظریۂ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں تخصیصی تجزیات کے ذریعے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ جس سے اقبال کے اسلوبِ شعر کے امتیازات اور لسانیاتی اختصاصات واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ نارنگ نے اس مضمون میں اقبال کے صرفی ونحوی امتیازات کو نمایاں کیا ہے۔

ساختیاتی فکر کے ضمن میں نارنگ کا پہلا مضمون ''ساختیات اور ادبی تنقید'' ۱۹۸۹ء میں ''ماہِ نو'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ باضابطہ ایک ضخیم کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' منظر عام پر لائے۔ اس کا پہلا حصہ ساختیات کو زیر بحث رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ پس ساختیات کے مباحث پر مبنی ہے۔ اور تیسرے حصہ میں مشرقی شعریات کو ساختیاتی فکر سے مربوط کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس میں ساختیاتی مکتب فکر کے بنیادی تصورات کو واضح کر کے ان کا تجزیہ کیا ہے۔ مثلاً: ساختیات اور ادب، ساختیات کی لسانی بنیادیں، روسی ہیئت پسندی، شعریات اور ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کی تفہیم جیسے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

مابعد جدیدیت کے پیچیدہ مسائل کی تفہیم پر بھی انھوں نے خوب لکھا ہے۔ وہ مابعد جدیدیت کے علم برداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مابعد جدیدیت کوئی تھیوری نہیں بلکہ یہ ایک صورتِ حال ہے جو پس ساختیات سے مختلف ہے۔ جیسے جدید معاشرے کی تیزی سے بدلتی ہوئی حالت، مسائل، مزاج، ذہنی رویے، ثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ مابعد جدید حالت ہے نہ کہ پس ساختیاتی حالت! لہٰذا پس ساختیات کا زیادہ تعلق تھیوری سے ہے اور مابعد جدیدیت کا معاشرے کے مزاج اور کلچر کی صورت حال سے۔ البتہ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تھیوری/ مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ مقدمات وہی ہیں جو پس ساختیات کے ہیں۔ مابعد جدیدیت کی ادبی فکر چاہے وہ نسوانیت کی تحریک ہو، نئی تاریخیت یا پھر ردتشکیل ہو وہ ساختیات اور پس ساختیات سے گزرتی ہوئی آئی ہے۔ انھوں نے ''قاری کی متن میں شمولیت'' پر بھی بحث اٹھائی ہے جس کی بنا پر ''قاری اساس تنقید'' کے ضمن میں بھی ان کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے اس نظریۂ نقد کے امتیازی پہلوؤں کی نشان دہی بھی دقتِ نظری سے کی ہے۔

''مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر'' کے باب دوم میں بہت سے مباحث اٹھا کر انھوں نے تجزیاتی پہلو سے اپنی گفتگو کو مبرہن کیا ہے۔ مثلاً ''وحدت مضمون در بیان مختلفہ'' کا سوال قائم کر کے مختلف حوالوں سے اس موضوع کو زیر بحث لایا ہے اور اس کی دلیل میں حافظ، میر، مصحفی، غالب، وزیر لکھنوی، یوسف علی خان ناظم وغیرہ کے اشعار کی توضیحات سے استفادہ کر کے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ علمائے بلاغت کم وبیش انہیں نتائج تک پہنچے جو ساختیاتی فکر میں عام ہیں یعنی زبان میں معنی افتراق پر مبنی ہوتے ہیں اور جب معنی افتراق پر مبنی ہوں تو دو لفظ ہم معنی کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور جب الفاظ ہم معنی نہیں ہو سکتے تو اشعار کیسے متحد المضامین ہو سکتے ہیں؟ گویا متحد المضامین اشعار کا تصور واہمے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ انھوں نے اس طرح کے بہت سے سوالات اٹھا کر مشرقی شعریات کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے۔ اور مشرق میں پائے جانے والے لفظ و معنی کے تصور، نیز قدما کے زبان و بیان کے مباحث کا ساختیات کی روشنی میں محاکمہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید فلسفۂ لسان کا تطابق مشرقی تصورِ نقد سے ہی مربوط ہے۔

نارنگ کی کتاب ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات شاعری کی تنقید میں انفرادیت کا مظہر ہے۔ یہ ضخیم کتاب بارہ ابواب پر محیط ہے۔ اس کے بعض ابواب خالص موضوعاتی مباحث سے سروکار اور بعض شاعری کی تنقید سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مثلاً: باب اول اور دوم میں غالب کے دو اہم ناقد حالی اور عبدالرحمٰن بجنوری کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ یادگار غالب کے متعلق ان کا خیال ہے کہ غالب کی جملہ خصوصیات کا جس اہتمام سے حالی نے احاطہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ اور غالب فہمی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب نے غالب شناسی کے باقاعدہ ڈسکورس کو شروع کرنے کی طویل مدت کو مختصر کر کے تفہیمی راہ کو آسان کر دیا۔ اس باب میں غالب شناسی کے متعلق حالی کی تمام بحثوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر اسے آگے بڑھایا گیا ہے۔ بطورِ خاص غالب کی بنیادی شناخت طرفگیٔ خیال، جدت اور ندرتِ مضامین کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ نارنگ نے اس کتاب میں کلامِ غالب کی نئی قرأت کے ذریعے تشکیلِ شعر اور معنی آفرینی کے تخلیقی رازوں کے متعلق کچھ اہم اور بنیادی سوالات اٹھا کر ان کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ معنی آفرینی کے جدلیاتی رشتوں کے پیش نظر بیدل شناسی اور سبکِ ہندی کی شعری جہتوں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ انھوں نے غالب کے مطالعے میں ''متن، شعر اردو کی قرأت اور معنیاتی تجزیے'' پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ انھوں نے غالب کے کلام میں جدلیاتی نفی کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غالب کا یہ وصف ہے کہ وہ خاص منطقی جدلیاتی نفی کے ذریعے معمولہ حقائق کو پلٹ کر نت نئی صورت حال کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی اس معنی آفرینی اور جدلیاتی کارکردگی کو اپنے تجزیے کے ذریعے واضح کیا ہے اور بڑی دقت نظری سے غالب کی جدلیاتی افتادونہاد، آزادگی و کشادگی، دقیقہ سنجی و پیچیدگی، معنی آفرینی و خیال بندی کو نمایاں کیا ہے۔ اس کتاب کے گیارہویں باب میں ''جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' اور بارہویں باب میں ''شخصیت، شوخی و ظرافت، آزاد خیالی اور جدلیاتی افتادومزاج'' کے عنوان سے غالب کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

مذکورہ مباحث سے واضح ہوا گوپی چند نارنگ اردو کے وہ نقاد ہیں جنھوں نے بڑی سنجیدگی اور امعان نظری سے شعروادب کی تنقید کا فریضہ انجام دیا۔ نظریاتی رو سے انھوں نے مغربی تصورات کا باریک بینی سے تجزیہ کر کے اس کا اطلاق اردو ادب پر کیا۔ عملی طور سے شعروادب کی تفہیم میں متن کے پورے سیاق و سباق اور انسلاکات کو مقامی تہذیب و تمدن، ہندوستانی فکر و فلسفہ، جدلیاتی نفی، بودھی فکر کے سرچشموں، قدیم تناظرات اور معنیاتی ساخت میں فن پارے کو جس باریک بینی اور دقت نظری سے جانچا اور پرکھا اور جس سطح سے متن کو اساس بنا کر شعر میں در آنے والے الفاظ کی روابطی ساخت کی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے، لفظ اور انتخابِ لفظ کی ترتیب و تہذیب سے ابھرنے والی دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی، معنی آفرینی، ندرتِ مضامین، خیال بندی اور جدلیاتی کارکردگی کی توضیح کی ہے وہ اردو تنقید میں انفرادیت کا مظہر ہی نہیں، بلکہ متن فہمی کی ایک نئی قرأت کا سنگ میل ہے۔

13.3.3 ماحصل

عزیز طلبا/ طالبات ! گوپی چند نارنگ لسانیاتی، اسلوبیاتی اور ساختیاتی تنقید کے نمائندہ نقاد ہیں۔ان کا تنقیدی سرمایہ اردو تنقید کی روایت میں نہایت وقیع ہے۔ بالخصوص ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں زیر بحث موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر ساختیاتی نقاد کی حیثیت سے نارنگ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔انھوں نے نئی ادبی تھیوری کا عمیق مطالعہ کر کے ساختیات، پس ساختیات اور اس کے ضمن میں آنے والے تمام مباحث کے حوالے سے اردو کی نظریاتی تنقید کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے۔اختصاص نقد یہ ہے کہ ان کے یہاں متن کا مطالعہ کبھی تو اسمیت وفعلیت سے سروکار رکھتا ہے اور کبھی مصوتوں اور مصمتوں سے بحث کرتا ہے، یا پھر ہکاری ومعکوسی یا صفیری ومسلسل آوازوں کی شماریات کو محیط ہے یا صوتیاتی اور نحویاتی خصوصیات کو واضح کرنے میں ساری قوت صرف کرتا ہے۔ان سبھی مطالعات کا بنیادی تعلق زبان وبیان کی نشان دہی اور امتیازی شناخت سے ہے۔انھوں نے لسانیاتی واسلوبیاتی طریق کار سے صرف نظر بھی دیگر زاویے سے شعروادب کا تجزیاتی مطالعہ کر کے متن فہمی کو وسعت بخشی ہے۔مثلاً: ان کی غالب تنقید متن کی تہوں میں اتر کر درنایاب کی تلاش وجستجو سے عبارت ہے۔بحیثیت مجموعی نارنگ بیسویں صدی کے ایک اہم نظریہ ساز نقاد ہیں جن کا تنقیدی کارنامہ اردو تنقید کے ارتقا میں اپنی شناخت ہمیشہ قائم رکھے گا۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/ طالبات !اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- گوپی چند نارنگ کے سوانحی حالات وکوائف کی جانکاری حاصل کی۔
- گوپی چند نارنگ کے ادبی کارناموں کی معلومات حاصل کی۔
- گوپی چند نارنگ کے تنقیدی افکار ونظریات سے واقفیت حاصل کی۔
- گوپی چند نارنگ کے تنقیدی تخصیصات اور انفرادی طریق نقد سے آگہی حاصل کی۔
- گوپی چند نارنگ کے تنقیدی مقام ومرتبے کو سمجھنے کی کوشش کی۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ گوپی چند نارنگ کی ملازمت، منصب اور اعزازات کے حوالے سے ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۲۔ گوپی چند نارنگ کی اہم کتابوں کے نام مع سنین بیان کیجیے۔

۳۔ اسلوبیاتی تنقید کے حوالے سے نارنگ کی تنقید نگاری سے بحث کیجیے۔

۴۔ ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' پر اپنی معلومات مختصراً قلم بند کیجیے۔

۵۔ گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کی نمایاں خصوصیات تحریر کیجیے۔

13.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ نارنگ نے اپنی ملازمت کا آغاز دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفنز کالج کی عارضی لکچررشپ سے ۱۹۵۷ء میں کیا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مستقل طور سے بحیثیت لکچرر تقرر ہوگیا۔اس کے بعد ترقیاتی زینے طے کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدرِ شعبہ اور پروفیسر ایمریٹس کے منصب پر فائز ہوئے۔انھوں نے اردو قومی کونسل کے نائب صدر، ساہتیہ اکادمی کے صدر اور امریکہ کی وسکانس، می ناسوٹا، میڈیسن جیسی یونیورسٹیوں کے وزٹنگ پروفیسر کے طور سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ جہاں نارنگ کو بہت سی سوسائٹیوں کی طرف سے اعلیٰ وظیفے ملے، وہیں ان کو بہت سے خطابات، اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا ہے، جن میں غالب اکادمی، اردو اکادمی (اتر پردیش اور بہار)، میر ایوارڈ، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، پدم بھوشن، ستارہ امتیاز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔نارنگ نے دنیا کے بیشتر ممالک کے سفر کیے تھے اس لیے انھیں ''سفیرِ اردو'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

۲۔ نارنگ کا تحقیقی نوعیت کا مقالہ ''اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ'' ۱۹۵۲ء میں مشتہر ہوا۔''اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات'' نوائے ادب میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔انھوں نے ''معراج العاشقین'' کو ۱۹۵۷ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔اسی طرح ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' ۱۹۶۰ء، ''اسلوبیاتِ میر'' ۱۹۸۵ء، ''سانحہ کربلا بطورِ شعری استعارہ: اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان'' ۱۹۸۶ء، ''امیر خسرو کا ہندوی کلام'' ۱۹۸۷ء، ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' ۱۹۸۹ء، ''قاری اساس تنقید: مظہریت اور قاری کی واپسی'' ۱۹۹۲ء، ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' ۱۹۹۳ء، ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'' ۲۰۰۲ء، ''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری'' ۲۰۰۳ء، ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت'' ۲۰۰۴ء، ''جدیدیت کے بعد'' اور ''فکشن شعریات: تشکیل و تنقید'' ۲۰۰۵ء، ''کاغذ آتش زدہ'' ۲۰۰۹ء، ''تپش نامہ تمنا'' ۲۰۱۱ء، ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' ۲۰۱۳ء ان کی اہم تصنیفات و تالیفات ہیں۔

۳۔ اسلوبیاتی تنقید کے ضمن میں ان کی کتاب ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' کلیدی درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے اپنے پہلے مضمون ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' میں اصول سازی کی ہے اور باقی مضامین عملی نمونوں پر مبنی ہیں۔مثلاً: ''اسلوبیاتِ میر، اسلوبیاتِ انیس، اسلوبیاتِ اقبال، فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام، عالی جی کے من کی آگ، شہریار: نئی شاعری اور اسمِ اعظم، بانی نئی غزل کا جوان مرگ شاعر، ساقی فاروقی: زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے؟، افتخار عارف: شہرِ مثال کا دردمند شاعر'' وغیرہ مضامین اسلوبیاتی تنقید کے عمدہ اور مثالی نمونے ہیں۔ان کی اسلوبیاتی تنقید کو سمجھنے کے لیے ''اسلوبیات

میر'' کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔اس میں انھوں نے صوتی ،نحوی اور لفظیاتی نظام کے تحت کلامِ میر کا تجزیہ کر کے اسلوبِ شعر کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی کی ہے۔انھوں نے انیس کے مرثیوں کا مفصل اسلوبیاتی مطالعہ کیا ہے۔جس میں سب سے پہلے انیس کے کمالِ فن کی پہلی اور بنیادی خوبی ، فصاحت سے بحث کی گئی ہے۔انھوں نے کلامِ انیس کے اسلوبیاتی مطالعے کے لیے بطور دلیل دو مشہور مرثیے ''نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری'' اور ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' سے چند بندوں کا انتخاب کر کے صوتیاتی تجزیہ دو سطحوں پر کیا ہے: اول مصوتوں اور مصمتوں کا تجزیہ۔دوم مصرعوں کے افعال کا مطالعہ۔اسلوبیات کے حوالے سے نارنگ نے اقبال پر دو مضمون تحریر کیے ہیں۔ پہلے مضمون میں اقبال کی شاعری کا صوتیاتی مطالعہ کیا ہے جس سے اقبال فہمی کا ایک نیا تناظر پیدا ہوا ہے۔ اقبال کے صوتیاتی نظام کے تجزیے کے لیے تین شاہکار نظموں (مسجدِ قرطبہ، ذوق وشوق،خضر راہ) کا انتخاب کر کے تینوں نظموں کا الگ الگ جائزہ لے کر ریاضی مشق سے ''صفیری و مسلسل آوازوں'' اور ''ہکار و معکوس آوازوں'' کا شماراتی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح دوسرے مضمون میں صرفی اور نحوی نظام کو نظریۂ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں تخصیصی تجزیات کے ذریعے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ جس سے اقبال کے اسلوبِ شعر کے امتیازات اور لسانیاتی اختصاصات واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۴۔ گوپی چند نارنگ باضابطہ ایک ضخیم کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر لائے۔اس کا پہلا حصہ ساختیات کو زیر بحث رکھتا ہے۔دوسرا حصہ پس ساختیات کے مباحث پر مبنی ہے۔اور تیسرے حصہ میں مشرقی شعریات کو ساختیاتی فکر سے مربوط کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس میں ساختیاتی مکتب فکر کے بنیادی تصورات کو واضح کر کے ان کا تجزیہ کیا ہے۔مثلاً: اس میں ساختیات اور ادب، ساختیات کی لسانی بنیادیں، روسی ہیئت پسندی، شعریات اور ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کی تفہیم جیسے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

۵۔ گوپی چند نارنگ اردو کے وہ نقاد ہیں جنھوں نے بڑی سنجیدگی اور امعان نظری سے شعر و ادب کی تنقید کا فریضہ انجام دیا۔نظریاتی رو سے انھوں نے مغربی تصورات کا باریک بینی سے تجزیہ کر کے اس کا اطلاق اردو ادب پر کیا۔عملی طور سے شعر و ادب کی تفہیم میں متن کے پورے سیاق و سباق اور انسلاکات کو مقامی تہذیب و تمدن ، ہندوستانی فکر و فلسفہ، جدلیاتی نفی ، بودھی فکر کے سرچشموں، قدیم تناظرات اور معنیاتی ساخت میں فن پارے کو جس باریک بینی اور دقت نظری سے جانچا اور پرکھا اور جس سطح سے متن کو اساس بنا کر شعر میں در آنے والے الفاظ کی روابطی ساخت کی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے، لفظ اور انتخابِ لفظ کی ترتیب و تہذیب سے ابھرنے والی دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی، معنی آفرینی، ندرتِ مضامین، خیال بندی اور جدلیاتی کارکردگی کی توضیح کی ہے وہ ان کی تنقید کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

13.7 فرہنگ

(لفظ)		(معنی)
تشخص	:	انفرادیت
سکونت پذیری	:	بود و باش/ رہائش اختیار کرنا
مزید برآں	:	اس کے علاوہ
مشتہر	:	شائع ہونا
خصائل	:	جبلت، عادتیں
قطعیت	:	یقینی
مبذول	:	ملتفت، مائل
کلیدی درجہ	:	بنیادی درجہ
مجرد	:	تنہا
معروضیت	:	حقائق سے ثابت شدہ
جہتیں	:	جہت کی جمع، طرفیں، سمتیں
مربوط	:	جوڑنا
باہم کرتا ہے	:	ملاتا ہے
استوار	:	مستحکم، ہموار
بسیط	:	پھیلاؤ، مفصل
جنگجو	:	جنگ کرنے والا، بہادر
تیغ	:	تلوار، شمشیر
یک لخت	:	اچانک، ایک ٹکڑا
استفادہ	:	نفع پانا، فائدہ اٹھانا
قدما	:	قدیم کی جمع، پچھلے لوگ
تطابق	:	باہم مطابق ہونا، موافقت
امعان نظری	:	گہری نظر، باریک بینی
دقت نظری	:	غور و خوض
اختصاصات	:	اختصاص کی جمع، خصوصیت
تناظرات	:	تناظر کی جمع، مقابلہ

13.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ (شخصیت اور ادبی خدمات) : شہریار/ ابوالکلام قاسمی

۲۔ زندگی نامہ: گوپی چند نارنگ : جمیل اختر

۳۔ گوپی چند نارنگ نمبر (عالمی اردو ادب) : نند کشور وکرم

۴۔ گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی : مناظر عاشق ہرگانوی

۵۔ دیدہ ور نقاد گوپی چند نارنگ : شہزاد انجم

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY